**حسن منظر**

ــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــ

**ایک اور آدمی**

و کٹوریاہمارے زُو کے تحقیقی سینٹر میں کیمیرون میں کہیں سے لائی گئی تھی۔

ہم آپس میں اُس کے حُسن کے بارے میں مذاق کیا کرتے تھے اور باتوں ہی باتوں میں اُسے نہ جانے کب ایفر وڈائٹی (Aphrodite) کہنے لگے تھے۔ دراصل یہ نام اسے ہمارے ذہین ساتھی نیٹ نے دیا تھا، اور اس کی وجہ میں ابھی بتاتا ہوں۔ خوب صورت جانور تھی ۔ اُس کے دانت فطرت سے لڑنے اور اپنا رزق ڈھونڈ نے میں ابھی خراب نہیں ہوتے تھے۔ بال صاف ستھرے،چمکیلے، سلیٹی اور چھوٹے نے سے بھی ہیں کے گوریوں کے ہوتے ہیں۔ اور اس کے بالوں سے ہم نے یہ اندازہ کا لیا تھا کہ اس کے زادبوم کی نباتات میں وائٹامِن اے اور ڈی کی کمی نہیں تھی۔ کھاں میں کہیں بھی وہ بے بال دھبے نہیں تھے جو خارش کا نتیجہ ہو سکتے ہیں اور جو تم میں سے ایک کو ہمیشہگھاس کے میدان میں چٹیل کولف لِنکس نظر آتے تھے۔ ہم سب گولف کھیلتے ہیں، اُس کو گولف سے نفرت ہے۔

ایفرو ڈائٹی سے مراد تھی حُسن کی دیوی ، جس کی اولاد سے زُو تو خیر بر سبی جائے گا، ہم اس کے بچے دوسرے ملکوں کو بھی بھیج سکیں گے۔اور تھوڑا اس طرف بھی اشارہ تھاھ کہ وہ گوریلوں کی دنیا میں جنسی عشق کے جھنڈےگاڑے گی اور گوریلے اس کا نیوڈ بنوائیں گے جسے اُن کی دنیا میں سراہا بھی جائے گا اور چھپایا بھی جائے گا۔ ان اولین خیالات کے بہت جلد بعد ہم میں سے ہر ایک کو وہ تصریر حُزن نظر آنے لکی، کیوں کہ چشم ِ خانون کی گہرائی سے اُس کی آنکھیں ہر آنے جانے والے کو بے بسی سے دیکھا کرتی تھیں اور چہرے کی سلوٹیں ایسے میں کچھ زیادہ ہی گہری ہو جاتی تھیں۔ لگتا تھا وہ سوچ میں ہے ۔ لیکن اس بات کو ہم نے زیادہ اہمیت نہیں دی کیوں کہ گوریلے یوں بھی سنجیدہ طبع ہوتے ہیں۔

وکٹوریا کا کھانا اکثر ادھر اُدھر پڑا رہتا تھا۔ اس کی شروعات پھلوں ، سیلیری اور کیلے کے تنے کی چھال سے کرائی گئی تھی جنہیں وہ بے دلی سے کھاتی تھی۔ پھر ہمیں خیال آیا شاید گوشت کیعادی ہے۔ اُسےمختلف قسم کے گوشت دیے گئے؛ انھیں اس نے بس سونگھ کر چھوڑ دیا۔ اس کا وزن کر رہا تھا اور میں ڈر ہوا کہ اس کے بالوں کی چمک بھی سنے والی ہے۔ اسے پھلی کے جگر کے تیل کے کیپسول دینے کی کوشش کی گئی لیکن اس معاملے میں وہ بیو من ماداؤں سے کم نہیں تھی جنہیں اکثر واکاسنز کی بو سے متلی ہونے لگتی ہے۔ وکٹوریا کیپسول کے بعد الٹی کر دیتی تھی۔

وہ دن ڈھلے بستر بنانے کی بھی عادی نہیں تھی حالاں کہ اس کے لیے قفس میں ڈنٹھل، شاخیںپنے سب ہی پڑے ہوتے تھے۔ اکثر پتا چلتا تھا وہ رات کو بہت کم ہوئی ہے، اور کیم ہے، اور کبھی کبھی کھڑی ہو کر چلنے لگتی تھی جیسے دور کی کوئی چیز دیکھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ دن میں زیادہ تر وہ پاروں ہاتھ پیروں پر چلنی تھییا دو میں آنے والوں سے پیٹھ موڑ کر بیٹھی رہتی تھی۔ اس میں وہ کھاڑ پن نہیں تھا جو اس عمر کے گوریلوںیا گور بلاؤں میں ہوتا ہے، یعنی جنھیں کم عمری میں زو کی دنیا میں لے آیا جاتا ہے، جس طرح انسان کے وہ ہے تھوڑا بڑے ہونے پر کھلنڈرے نکلتے ہیں جو قید خانے میں پیدا ہوے ہوں یا جو ماں کے ساتھ جیل میں آئے ہوں۔

نیٹ جو گفتگو میں سب سے زیادہ آزادی برتتا ہے، شروع کے دنوں میں وکٹوریا کے بارے میں کیا کرتا تھا:" نہ جانے کتنے نوجوان ڈینڈی (چھبیلے ) گوریلے اس کییاد میں افریقہ کیجھاڑی (bush) میں دم توڑ ر ہے ہوں گے، کتنوں نے خود کشی کی ہو گی ۔ شی از اےبیوٹی !"

وہ ہم میں سب سے زیادہ ذہین ہے اور اس کا گوریلوں کی نفسیات پر پچھلے دسبیس برس کا کام بہت اسم مانا جاتا ہے۔ وکٹوریا کے قفس کے جنگلے کو پکڑے وہ دیر تک آنمیں سے اسے دیکھتا رہتا تھا اور سگریٹ کا دھواں قفس کے اندر چھوڑتا رہتا تھا۔ کسی رفیق کے پاس آجانے پر وہ و کشوریا کے بارے میں کوئی ایسی بات کک دیتا تھا جو مہذب لوگ یہ پہلی عورتوں کے بارے میں بھی نہیں کھتے ہیں۔ لیکن کو جاتے ہیں اسے تمام گوریلوں سے کتنی الفت ہے، کتنا وہ اُن کا خیال رکھتا ہے ۔

ایک دن اس نے کوفی بریک میں بڑی فکر مندی سے کہا ، "وکٹوریا ڈپریسڈ ہے۔"

ہم سب چپ رہے۔

تھوڑی دیر بعد آنکھیں بند کیے کیے اس نے کہا، "وکٹوریا عمر کی آگئی ہے۔ اُسے ایسٹرس (estrus) ہو تا ہے۔"

"پھر؟ کسی نےکہا۔

"علاج بہت آسان ہے، "اس نے کھلکھلا کر ہنستے ہوے کہا۔ "ہمیں اس کی تنہائی کو ختم کرنا چاہیے۔"

زو میں نئے آنے والے جانوروں کو ایک مدت تک پرانے باسیوں سے دور رکھا جاتا ہے، لیکن وکٹوریا کے معاملے میں یہ پابندی اٹھالی گئی۔

لیکن وکٹوریا نے اپنے نئے ، جوان ساتھی ہیکٹر کا کھلے بازووں سے سواگت نہیں کیا جو زو ہی میں پل کر بڑا ہوا ہے اور ہم سب سے کافی آزاد ہے۔ وکٹوریا کی سردمہری کی وجہ سے ہیکٹر کو دوبارہ اس کے کٹہرے میں بھیج دیا گیا اور بظاہر یہ معاملہ ختم ہوگیا۔

لیکن ہمارے ذہین ساتھی نے ایک اور دن کوفی بریک میں اعلان کیا:"وکٹوریا خاندان ان بنانے کے رستے میں ہے۔"

ہم اتنی دیر تک نیٹ کو مبارک باددیتے رہے کہ اسے کہنا پڑا، "مگر میں تو باپ نہیں ہوں ۔ جاکر ہیکٹر کو مبارک بادو۔" اس جیسا منھ پھٹ ہم میں سے کوئی دوسرا نہیں تھا۔

وکٹوریا کے قفس میں دوسرا متنفس نہیں تھا، نہ ہی وہ جہاں تھی وہاں دوسرے گوریلوں کی آواز پہنچتی تھی۔ لیکن وہ پھر بھی خوش نظر آتی تھی۔ وہ پھل ، جڑیں، کو نپلیں اورہری چھالیں سب شوق سے کھانے لگی ۔ اس کا وزن بڑھ رہا تھا۔۔ اور ہمارے خیال میں نیٹ کا بھی ۔ لوگوں میں اب بھی اُسے دل چسپی نہیں تھی لیکن تھوڑی بہت اُچھل پھاند کر نے لگی تھی۔ یہاں تک کہ ایک دن اسے اسقاط ہوگیا اور قفس میں بڑا دلدر ہوا۔

کوفی بریک میں نیٹ نے کہا:

"یہاں اسے گائیڈ کرنے والی کوئی دوسری ہستی نہیں ہے۔ بیچاری ایک دم معصوم ہے۔"

پھر اس نے کہا، "ہمارے پاس کوئی اور تجربہ کار مادہ بھی نہیں ہے۔"

کسی نے کہا، "ہم سب کی بیویاں تجربہ کار ہیں، تمھاری بھی۔"

بیٹ نے مذاق کو نظر انداز کرتے ہوے کہا، "اس وقت وہ کسی عورت کو اپنے پاس پھٹکنے دیتی؟ پھاڑ کھاتی۔

اور یہی باتیں اس نے بڑی سنجیدگی سے وکٹوریا کے دوسرے اسقاط پر کہیں۔ اب وہ وکٹوریا کے لیے پیار میں کوئی چار حرفی لفظ استعمال نہیں کرتا تھا۔ اسے جنس کی بھوکی کتیا کہنا وہ بہت پہلے چھوڑ چکا تا کیوں کہ اس نے دیکھ لیا تھا اس معاملے میں بقول اس کے وکٹوریا برف میں لگی شمپین کی طر ح سرد تھی۔

دوسرے ساتھی بھی اسے ایفروڈائٹی کہنا ترک کر چکے تھے، جو وہ بے وجہ کہنے لگے تھے۔

لیکن ہم جانتے تھے معاملہ زو میں گوریلا کی افزائش نسل کا تھا جو بہت کم کامیابی سے ہم کنار ہوتا ہے۔ حمل کے دوران اچھل پھاند تو جنگل میں سب ہی مادائیں کرتی ہیں: میلوں خوراک کی تلاش میں پھرتی ہیں اور کسی کو اسقاط نہیں ہوتا۔

یہ بات بار آوری (fecundity) کے تجربے کرنے والے انسٹی ٹیوٹ کے دو پرجوش ڈاکٹروں جوڈی اور بوب سے بھی گفتگو میں آئی جن کے اپنے کوئی بچہ نہیں ہے لیکن جو عورت کے انڈے کو رحم سے باہر مرد کے اسپرم میں فرٹی لائز کرانے میں مہارت رکتھے ہیں۔

وکٹوریا کے ڈپریسڈ اور بے اولاد ہونے کا سن کر دونوں کی آنکھوں میں خوشی کی چمک پیدا ہوئی اور ایک لمحے کےلیے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کے بعد دونوں ایک ساتھ یہ چند جملے کہے:

"ہوسکتا ہے اس کا ڈپریشن بے اولاد ہونے کی وجہ سے ہو۔"

"ہوسکتا ہے اس کا رحم یا انڈا اسپرم کو رد کردیتا ہو۔"

"گوریلا اسپرم کو۔"

"ہوسکتا ہے کسی دوسرے میمل کے اسپرم کو رد نہ کرے۔"

"انسانی اسپرم کو۔"

شوہر اور بیوی نے تجربہ کرنے والوں کی بے اختیار خوشی اور اتنے جوش کے ساتھ یہ جملے کے کہ ہم سب بھی ان کے ولولے کی لپیٹ میں آگئے۔ یہ حقیقت تھی سور کا دل انسان کی چھاتی میں لانے کا تجربہ کیا جا چکا تھا اور جانوروں کا اور بہت کچھ انسانی جسموں میں وقتافوقتاً منتقل کیا جاتا رہا تھا۔ کیا ہوا اگر وصول کرنے والے کے جسم نے اسے تھوڑے ہی دن بعد تھکرا دیا تھا۔ یہاں ٹھکرائے جانے سے وکٹوریا کی جان پر تو بن نہ آتی۔ تجربہ محفوظ نوعیت کا تھا۔ لیکن نیٹ کچھ پرجوش نظر نہیں آرہا تھا۔

وکٹوریا کا وزن تیزی سے گر رہا تھا۔ لیلے اور بھٹے اور انناس اس کے آس پاس پڑے رہتے تھے لیکن چاروں ہاتھ پاؤں پر چلتے ہوے وہ انھیں رک کر سو گھتی بھی نہیں تھی۔ زیادہ وقت اس کا قفس کے جنگلے کی طرف پیٹھ کیسے بیٹھے رہنے میں گزرتا تھا جیسے اسے آس پاس کی دنیا سے نفرت ہو۔ اس کا راتوں کا رونا آکور بڑھ گیا تھا جو گہری گونجنے والی آواز میں دور تک سنا جاسکتا تھا۔ جس عورت کو کبھی حمل نہ ہوا جو وہ اولاد کے لیے اتنا نہیں روتی ہے جتنا وہ جس کا حمل ضائع ہو گیا ہو۔

آخر ایک دن سیڈیٹوز (sedatives) دے کر وکٹوریا کو اوپریشن تھیٹر لے جایا گیا۔ اسے وہاں لے جائے جانے میں جوڈی اور بوب اس کی ٹرولی کے ساتھ بے تابی سے چل رہے تھے۔ نیند میں ڈوبی ہوئی وکٹور یا آہستہ سے آنکھیں کھول کر بدلتے ہوے کوریڈورز کو دیکھتی تھی اور پھر آنکھیں بند کر لیتی تھی۔

اوپریشن میں خاصی دیر تھی اور ہم میں سے اکثر مذہب میں اعتقاد نہ رکھنے والے بھی اس کے موش میں آنے کی دعا مانگتے رہے۔ آنکھیں کھولنے پر وکٹوریا نے اُلٹی کی۔ اپنے جسم کو ادھر ادھر سے ٹٹول کر دیکھائیے اُسے پتا چل گیا ہو کہ اس کے ساتھ بے ہوشی میں کوئی حرکت کی گئی ہے۔

تجربہ ہماری امید کے مطابق ناکام رہا۔ لیکن تجربہ کرنے والوں کی دنیا میں ناکام تجربے بھیاپنی اہمیت رکھتے ہیں اور ان سے تجربہ کرنے والے کی امنگ اور اپج کی دھار کند نہیں ہوتی، اور تیز ہوجاتی ہے۔"سائنٹفک جرنل اوف بایو لوجیکل ریسرچ" اور "آرکائیوز اوف پروبلمز ان اوبسٹیٹرکس اینڈ جنے کو لوجی" میں دومقالوں کے شائع ہونے پر ہمارے پر جوش ساتھے چند روز بے حد خوش رہے اور جیسا کہ ہوا کرتا ہےایک تحقیقی کام دوسرے کام کی راہ کول دیتا ہے، ایک دن ہمارے جواں سال ساتھوں نے کہا:

"ہمیں معلوم ہے کیا غلط ۔"

"وکٹوریا کا انڈاناقص ہے۔ قصور صرف ہیکٹر یا مرد کے اسپرم کا نہں تھا۔"

"ہم چاہتے ہیں اس دفعہ ہیومن مادہ کا انڈا استعمال کیا جائے۔"

نیٹ جو آب تک جلا بھنا خاموش بیٹھا تھا، اپنی ہنسی روک نہیں سکا۔ پہلے اس نے کس کر اپنے ہونٹوں پر ہاتھ رکھا کہ بدمعاشی کا جو خیال اسے آیا تھا کہیں بات بن کر عورت کی موجودگی میں اس کے منہ سے نکل نہ جائے۔ پھر فقہ کا کر بولا، "میں ضبط نہیں کر سکتا۔ " اور معذرت کرتے ہوے اس نے جو مشورہ بوب کو دیا وہ اس کی ہنسی میں کھو کر رہ گیا۔ لیکن ہم نیٹ کی بات سمجھ گئے اور ہنسنے لگے۔ جوڑی بھی سمجھ گئی اور اس نے بوب کو کھنی ماری کہ اشارہ اس کی طرف تھا۔ وہ اٹھارہ بیس سال کے لڑکے کی طرح جھینپ گیا اور اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

و کٹور یا ان دنوں سخت بے زاری ، اداسی میں گرفتار تھی اور اس کی کھال میں جھول پڑ گئے تھے۔

دوسرے تجربے کے لیے سویچ بہار ہوا۔ اوپر یشن میں وکٹوریا کے لیےیقیناً خطرہ تھا۔ ہو سکتا تھا وہ انیستیزیا سے واپس ہوش ہی میں نہ آئے۔ اس کے دوبارہ کیمیرون بھیجے جانے کے امکان پر بھی غور کیا گیا اور ہوائی جہاز سے سفر کے خطرے اور جھاڑی میں اس کے آزاد گوریلوں کے ہاتھوں مارے جانے کے احتمال کے پیش نظر اس تجویز کو بھی رد کر دیا گیا۔ دنیا میںیہ امن پسند جانور اتنے کم رہ گئے ہیں کہ ہم ایک آور کو جان بوجھ کر موت کے حوالے کرنے کو تیار نہیں تھے۔ یہ ہمیں معلوم تھا کیمیرون میں دو جہاں سے لائی گئی تھی گوریلوں کے کئی گروپ ایسے تھے جن کا لیڈر شکاریوں کے ہاتھوں مارا جا چکا تھا اور باقی جانوروں میں بکھرے ہوے خاندانوں کے افراد کی طرح ایک دوسرے سے لگاو نہیں تھا۔ ایسے کسی گروپ میں اسے چھوڑنا جان بوجھ کر اس کی بنیا کرنے کے مترادف ہوتا۔ سمندری سفر طویل ہوتا اور راستے ہی میں دم توڑ دینے کی وجہ سے بے چاری کی تعبیر پانی میں بنتی جس کے لیے ہم میں سے کوئی تیار نہیں تھا۔مختصر یہ کہ و کٹور یا ہم سب کے دل میں گھر کر چکی تھی۔

لیکن تحقیق کا جوش کسیچھوت والی بیماری سے کم نہیں ہوتا ہے اور ساتھ میں کا م کر نے والوں کو آسانی سے لگ جاتا ہے۔ ہمیں بھی لگا اور ہماری مرضی اور فہم کے خلاف لگا۔

جب وکٹوریا دوسری بار اوپریشن تھیئٹر میں تھی، ہم سب اس طرح باہر لاؤنج میں بیٹھے تھے جیسے کسی اپنی عزیز کے اوپر یشن کی کامیابی یا ناکامی کی خبر سننے کے منتظر ہوں۔ اور انھیں کی طرح ہم توجہ ہٹانے کو ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے۔ نیٹ نے اوپریشن کے وقت اندر موجود رہنے کا فیصلہ کیاتھا۔

کچھ دیر خاموش بیٹھ کر ہم مختلف ملکوں کے سیاسی حالات پر گفتگو کرنےلگے اور ہمیں تعجب ہوا اتنے دنوں ہم خبریں پڑھتے، سنتے اور دیکھتے تو رہے تھے لیکن جیسے ان حالات سے خود انسولیٹڈ (insulated) تھے۔ نہ رو آنڈا میں ایک نسلی گروہ کے دوسرے گروہ کے ہاتھوں مٹائے جانے کی خبروں کا ہم پر کوئی زبردست جذباتی اثر ہوا تھا نہ چچنیا میں مسیب روسی طاقت کے ایک انتہائی قلیل قوم کو بے دردی سے کچلنے کا۔ اجودھیا بھارت میں چند سال پہلے ایک اقلیت کی عبادت گاہ کو ایک کثیر اکثریت والے مجنونوں نے ڈھایا تھا۔ اس نفرت کے جوالامکھی کی راکھ ابھیتک وہاں کی آبادی پر گر رہی تھی۔ پاکستان کے سب سے بڑے شہر کراچی کا حال پندرہ بیس سال پہلے کے بیروت سے بد تر تھا جہاں وہ جنہیں زمین کے بیٹے نہیں مانا جاتا تھا اور بے اقتدار بے بس تھے، چند سالوں سے اپنے دس بیس افراد کی لاشیں روزانہ سوکھی ندیوں کی تکمٹی اور سڑکوں سے اٹھانے پر مجبور تھے اور کھا جا رہا تھا وہ خود اپنے قاتل تھے، اپنے ہی گھروں ) اور محلوں میں دہشت پھیلا رہے تھے۔ سومالیا، عراق، ليبيا، بوسنیا ہرزگوینا، اسرائیل، کشمیر سب، جہاں جہاں طاقت ور کم زور کو ختم کر کے اپنے لیے زیادہ سے زیادہ جگہ بنا رہے تھے، عالمی خبریں تھیں، لیکن وکٹوریا کی بڑھتی ہوئی اداسی اور گرتی ہوئی جسمانی صحت نے ہم کو سب کچھ بلا رکھا تھا۔ اور اس وقت جب وہ اندر لیٹی ہو گی، ہم جو اس کے لواحقین تھے، باہر بیٹھے ان خبروں پر تبصرہ کر رہے تھے ، جیسے آج ہی ایک ساتھ یہ خبریں سنی ہوں ۔

پھر چرس، ہیروئن، کوکین اور اسلحے کے بڑے پیمانے پر اسمگل کیے جانے کی خبر یں چھڑ گئیں اور فوراً ہی مزدور بچوں اور بینکاک کی طوائف بچیوں کا ذکر آگیا۔ ہم نے ان ملکوں کے نام اپنے ذہنوں میں ڈھونڈے جہاں جہاں یہ کارو بار ہورہا ہے اور وہاں کی حکومتوں کی ایما سے ہو رہا ہے۔ یہ کھتے ہوے ہمیں خیال آیا کہ کونگو،یوگینڈا، کیمیرون کی وہ دنیا جو و کٹور یا سے چھین لی گئی ہے، اس دنیا سے کتنی مختلف ہے جس کی خبروں سے اخبار پٹے پڑے ہیں۔ کسی نے کہا،" اچھا ہے اسے خبر ہے کہ وہ کہاں آ گئیہے۔ "اسی وقت اور پریشنتھیئٹر سے پہلے میاں بیوی کی ٹیم باہر نکلی اور ان کے جلو میں ہمارا ذمیں ساتھی نیٹ اور اوپریشن تھیٹر کا عملہ۔

"وکی کا اوپریشن کے دوران ایک دفعہ دل رک گیا تھا، "ہمارے ساتھی نے فیس ماسک سے ماتھے کا پسینا پونچھتے ہوے کہا۔

" اب وہ کیسی ہے ؟ ہمارے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"کچھ کچھ ہوش میں آچلی ہے۔"

اپنے قفس میں پہنچ کرو کٹوریا نے تین بار الٹیاں کیں جن میں صرف پانی تھا، اپنے نچلے جسم کا جائزہ لیا اور غفلت میں چلی گئی۔

بعد کے دنوں میں وکٹوریا سے زیادہ ہم منتظر رہے کہ دیکھیں کیا پیش آتا ہے۔ جیوں جیوں اس کاپیٹ بڑھ رہا تھا اس کا جو نچلا ہی واپس آتا جا رہا تھا۔ زیادہ اچھل کود سے روکنے کے لیے اسے سینڈیٹوزدیے جا رہے تھے۔ اب وہ کھڑی ہو کر پیروں پر چلتی ہوئی جنگلے تک آ جاتی تھی اور ہاتھ بڑھا کر بسکٹ مکسی کی کھیلیںیا جو کچھ بھی دیا جائے لے لیتی تھی۔ اس کی نیند درست تھی ، راتوں کا ماتم رک چکا تھا، بول و برازکے نظام صحیح کام کر رہے تھے، بالوں میں بھی دوبارہ چمک آچلی تھی۔ مختصر یہ کہ و کشور یا خوش تھی۔

وقت آنے پر اس کے لیے زندگی کا انتظام کیا گیا، ایسا کہ اسے اس وقت نہ کوئی انسان دیکھ رہا ہو نہکوئی جانور ۔ اس کے پاس اوڑھنے بچانے کو بہت کچھ تھا اور ہر وہ چیز جس کی اسے ضرورت ہو سکتی تھی۔ اس کے قفس میں چند اور چیزیں بھی تھیں جن کی اسے خبر نہیں تھی بچھے ہوے گہرے اور مائیکروفون ۔ اس رات ہلکی دودھیا روشنی میں تکلیف کے عالم میں وہ ٹھلے جا رہی تھی اور شاید جگہ کا انتخاب بھی کر رہی تھی۔ آخر کار فرش پر ایک جگہ اس نے ادھر ادھر سے اٹھا اٹھا کر ملائم ڈنڈیوں ، شاخوں اور پتوں کا ڈھیر کر دیا اور اس پر بیٹھ گئی۔ ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا اور بوب نے فتح مندی کے اظہار میں ایک انگوٹھا کھڑا کر کے اپنا اکتا ہاتھ ہماری آنکھوں میں لہرایا۔ وہ بائیں بنا تھا۔

و کٹور یا نے خود کو رات کے دو ستائیس پر تکلیف سے چھڑایا۔ ہم میں اوٹس میں بیٹھے پورے عمل کو دیکھ رہے تھے اور منتخب تھے وہ سب کام اس طرح کر رہی تھی جیسے اس کی عمر چھ سات سال نہ ہو دس پندرہ سال ہو اور ساری زندگی وہ ہے جنوا نے ہی کا کام کرتی رہی ہو۔

تکلیف سے فارغ ہو کر اس نے روتے ہوے ہے کو گھبرا کر اٹھایا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ کبھی اس کے ہاتھ پیلے کے سر پر جاتے تھے اور کبھی کانوں پر جو شاید اس کی توقع سے بہت زیادہ بڑے تھے۔ اس نے جلدی جلدی کئی بار ہے کی انگلیوں کو کھولا اور بند کیا، گھبراہٹ میں دو ایک بار سے سونگھا اور پھر ہاتھوں میں اٹھا کر روشنی کی طرف بلند کیا۔ اس وقت اس کے منہ سے وہی گونجنے والی گھری آواز نکلی جو رات کو سنی جاتی تھی لیکن اس سے ہزار گنا تیز، جو سینے کی گہرائی سے نکلی تھی۔

ہماری نظر یں وکٹوریا سے ہٹ کر اس کے کرم فرماؤں پر گئیں ۔ دونوں بڑے انہماک سے اس میں کو دیکھ ر ہے تھے اور نوٹس لینے جا رہے تھے کہ زچگی کی کون سی اسٹیج کتنے منٹ یا گھنٹے کی تھی۔

و کٹوریا نے ہے کو نرمی سے اپنے پتوں اور شاخوں کے بستر پر لٹا دیا اور قفس کی جنت کی طرف جاتے ہوے غیر مسلسل بھونکنے کی سی چند آوازیں نکالیں۔

جب ہم اس کی آواز یں اچانک بند ہونے پر اس کے قفس میں پہنچنے تو بچہ پتوں اور کنپلوں کی ڈھیری پر سو رہاتھا ۔ وکٹوریا کے بارے میں بس اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ شہر کے مرد دہ عجائب گھر کی زینت بنے کگئی کیون کہ اس کی لاش ٹیکسی ڈرمسٹ کے حوالے کر دی گئی ہے۔

وکٹوریا کا ہمارا کل 560 دن کا ساتھ ہرہا۔

٭٭

**آصف فرخی**

**شہر بدری**

شور تھوڑی دیر کے لیے بھی نہیں رُکتا اور وہ ایک ایک کر کے جا نے لگتے ہیں ۔ وہ اپنی چیزیں سمیٹتے ہیں اور وہاں سے چلے جاتے ہیں۔

کوئی الوداع نہیں کہتا۔ کوئی کچھ بھی نہیں کہتا۔

وہ بھی کچھ نہیں کہتے۔ ان کے جانے سے کتا بیں زور زور سے بند کرنے، ڈیسکپٹخنے، پیر رگڑنے کی وہ آواز میں نہیں آتیں جو ہاف ملائم کی گھنٹی بجتے ہیں بھگدڑ سی مچا دیتی تھیں۔ نہیں، اس طرح کی کوئی بات نہیں۔ بے آواز اور بے زبان سے وہ ایک ایک کر کے کم ہونے لگے اور چہروں کی قطار میں خالی جگہ رہ گئی جہاں اس سے پہلے وہ تھے۔

ایک دم سے دیکھو تو پتا چلتا تھا: ارے، یہاں تو وہ ہوتا تھا۔۔۔ وہ۔۔۔ بھلا سا نام ہے اس کا ؟ اور وہ، اور وہ۔۔۔ ارے بھئی کہاں چلے گئے سب کے سب ؟ ایک خلا سا رہ گیا اُن کی جگہ جو فوراً نظر بھی نہیں آتا۔

لیکن یہ سوال کوئی نہیں پوچھتا۔ یوں بھی شور بہت ہے۔ " باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں"، اسکول کا بینڈ زور و شور سے اس دھُن پر اپنی پریکٹس جاری رکھے ہوے ہے۔ یہ اسکول کا گیت نہیں ہے، تم کو شک ہورہا ہے اور تمھارا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ بات بت بہت بگڑ گئی ہے۔ کاش یہ سب محض ایک خواب ہو۔ لیکن ایسا کیسے ہو سکتا ہے ؟ انھی تمھاری طرف اشارہ کر رہی ہے۔ شرمندگی اورپشیمانی کے بوجھ تلے تم اس وقتدب بھی جاؤ گے تب بھی زمین نہیں پھٹے گی کہ تم اس میں سما جاؤ۔ امیگریشن والے کاؤنٹر پر دستاویزات جانچنے والے افسر کے درشت چہرے کے خدوخال مانوس نظر آنے لگتے ہیں اور تمھارے دیکھتے دیکھتے وہ مسز کنگھم کی بھاری آواز میں پکارنے لگتا ہے: ہری اپ،کم آن، نیکسٹ ! ہُواِزنیکسٹ؟ تمھیں پتا کہ نیکسٹ کون ہے : وہ تم ہو۔ اب بچ نہیں سکتے ۔ اپنے آپ کو گھسیٹ کر سامنے ولانے کی کو شش کرتے ہوے جیسے تمھاری جان نکلی جارہی ہے۔ تمھاری آنگھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا ہے ۔ گردن کے پیچھے پھوٹ پڑنے والے ٹھنڈے پسینے سے سارا بدن شل ہوا جا رہا ہے۔۔۔

"ضمیر ، ضمیر ، کیا ہوگیا تمھیں؟" جھنجھوڑ کر جگا دینے والے یہ ہاتھ ثمینہ کے ہیں۔چند لمحے لگتے ہیں یہ سمجھنے میں کہ تم گھر میں اپنے بستر پر لیٹے ہوے ہو اور برسوں پہلے کے اسکول ڈیسک کو مضبوطی سے تھام کر مسزکنگھم کی ڈانٹ سننے سے ڈرنے کے اس لمحے میں نہیں جی رہے ہو جو مسلسل کئی دن سے تھیںخواب میں دکھائی دے رہا ہے۔

وہ ہم سے مختلف ہیں ، حساب کا گھنٹا نہ ہوتا تو شاید مجھے اس کا پتا بھی نہ چلتا۔ ورنہ جیسے اَور سارے لڑکے ہوتے ہیں۔۔۔ بس یہ تھا کہ ان کی رنگت زیادہپکی تھی اور دانت بہت چمکتے تھے جب وہ ہنستے تھے۔ مختلف تو سارے لڑکے تھے، شکلوں میں ، اسکول کے بستوں اور آنے کے طریقوں اور امی ابوؤں میں فرق۔ مقصود کم کم کرتی جیپ سے اترتا تھا تو اس کا خاکی وردی والا ڈرائیور بیگ اور تھرماس لے کر کلاس روم تک آتا اور سلیوٹ مارتا تھا۔ ابرار بہت قاعدے سے کتابیں ہاتھ میں اٹھا کر ایمپریس مارکیٹ تک بس میں آتا اور بیگ کے بوجہ سے (ہمارے لیے قابل رشک حد تک آزاد ہو کر مسکراتا ہوا، سیٹی بجاتا ہوا، گھومتا گھامتا اسکول آتا۔ احمد علی کے ابو کہیں باہر گئے ہوے ہیں اور پائین کے ابو اس دنیا میں نہیں ہیں۔ فرق تو بہت سارے تھے۔ گھنٹی بجتی اور لیسٹر کا ٹائم ہو جاتا، مسز ستم آکر ہم سے کتابیں نکالنے کے لیےکھتیں۔ رشید منہ پھیلا کر سبق کا نام لیتا تھا: "ایرا میتھک ، " اور بوسکو بڑے اسٹائل سے یہ لفظ ادا کرتا : "وتھ میتھک - ہم سیکھ رہے تھے کہ اس مضمون کا نام "میتھے میٹکس اپنی کاپیوں پر لکھ لینا چاہیے کیوں کہ اب اس میں ارتھ میٹنگ کے ساتھ ساتھ الجبرا اور جیومیٹری بھی شامل ہو گئے ہیں۔ ہم ایک کلاس او پر جو آ گئےہیں۔

یہ ایک کلاس او پر بڑھنا بھی اچھی خاصی مصیبت تھی۔ اسکول کا کام جو اتنا بڑھ جاتا تھا۔ میں بے زار آ کر سوچتا: آگے چل کر کیا ہو گا ؟ مشکل سے بڑھ کر مشکل یہ طرح طرح کے سوال جوڑنے، لوئسٹ کامن ڈینومینیٹر اور بائیسٹ کامن فیکٹر اور یونٹری میتھڈ اور فریکشنز ۔۔۔ لگتا تھایہ حساب نہیں کچھ اور ہے۔ ایک ڈراونا خواب لگتا تھا یہ سب میری سمجھ میں بھی پوری طرح نہیں آتا تھا۔ کلاس میں بیٹھابیٹھا جانے کہاں کھویا رہتا اور جب مسزککتنگھم ڈانٹ بتائیں تو چونک کر اپنے آگے والے ڈیسک پر بیٹھے ہوے عبد الباطن کی کاپی سے دیکھ کر نوٹ کرنے لگتا۔ ٹیچر کی نظر بچا کر عبد الباطن مجھے سمجھانے اور نوٹ کرانے لگتا تھا، لیکن وہ مجھ پر ہنسنا نہیں بھولتا تھا۔ (وہ ہنستا تھا تو پکے رنگ کے چہرے پر دانت کھل اٹھتے تھے۔) پھر بھی وہ سب سے پہلے کلاس ورک ختم کر کے مسز کننگھم سے چیک کرانے جاتا تو اس کے صفحے پر اسٹار بناتے ہوے وہ ساری کلاس سےفخریہ کہتی تھیں: فار بم اِٹ اِز میتھے میجِک ! "

یہ میجک نہیں تھا تو پھر کیا تھا؟ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ابو سے بھی پوچھا تھا میں نے۔ " یہ لوگ مچھلی کھاتے ہیں اس لیے ان کے دماغ تیز ہو جاتے ہیں، وہ کہتے تھے۔ مچھلی اور میتھے میٹکس کا یہ تعلق میریسمجھ میں نہیں آتا تھا۔ مچھلی تو ہم بھی کبھی کبھار کھاتے تھے، بلکہ جاڑوں میں جب خشک ہوا سے کھال پھٹنےلگتی اور سویٹر کے ساتھ مفلر اوڑھ کر اسکول جانا ضروری ہو جاتا تو امی ہمیں سنہری رنگ کی ایک گولی روز کھلاتی تھیں۔" مچھلی کے تیل کی گولی ہے یہ، " وہ ہمیں بتایا کرتی تھیں۔ اس کی شیشی پر کھلے بادبان کی کشتی بنی ہوتی اور اس کے اوپر سنہری حروف میں لکھا ہوتا: سات سمندر۔ ہوتی ہو گی اس میں طاقت، مجھے اس گولی سے نفرت تھی۔ اس لیے کہ ایک دفعہ میں نے چبا لیا تھا اسے اور کتنی ہی دیر تک ایسی کڑواہٹ حلق میں گُھلتی رہی کہ آج تک بھلا نہیں سکتا وہ لیس دار کڑواہٹ۔ گولی منھ میں رکھ کر امی کے جانے کے بعد ہاتھ روم میں اگل دیا کرتا تھا۔ یہ میرا راز تھا۔ اس کا اسکول سے، مسز کننگھم کے دیے ہوے ہوم ورک سے یا مجھ سے آگے کے ڈیسک پر بیٹھنے والے عبد الباطن سے بھلا کیا تعلق مو سکتا تھا، یہ سب میرے دماغ میں گڈمڈ ہو گیا اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ مچھلی وہ بہت شوق سے کھاتا تھا، میں نے اس سے پوچھ لیا تھا۔ پھر ایک مرتبہ میں نے اسے مچھلی کھاتے ہوے بھی دیکھا تھا۔ اسکول ڈے کے ساتھ اینول فیسٹ تھی اور ہم سب اچھے اچھے کپڑے پہن کر آ ئے تھے تو ہیڈماسٹر کے آفس کے ساتھ والے بال میں ڈائننگ ٹیبل پر لے جایا گیا تھا ہمیں ۔ رنگین قمقموں میں اسکول بھی مختلف لگ رہا تھا اور میرے روز کے دیکھے ہوےساتھی بھی ۔ میں سالن روٹی پلیٹ میں نکال کر شوق سے کھانے لگا کہ کسی نے ٹہوکا دے کر میرے کان میں کہا: "دیکھو، وہ دیکھو بھات اور مچھی کھا رہا ہے بھو کا کہیں کا ! "ڈائننگ ٹیبل پر ایک بڑی سی قاب میں فش فرائی بھی تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ عبد الباطن نے میرےدیکھتے ہی دیکھتے مچھلی کا اتنا بڑاٹکڑا روکھا اٹھا کر منہ میں رکھ لیا، پھر میں صفائی سے اس کے کانٹے نکال نکال کر اپنی پلیٹ میں ایک طرف رکھنے لگا۔ مجھے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر وہ مسکرایا اور ہاتھ بلا کر سلام کرنے لگا۔ میں نے جواب دیا۔ وہ پھر منہ سے کانٹے نکالنے لگا، اتنی ہی صفائی سے جیسے بوسکو انگلش بولتا تھا: "وتھ بیٹک !" وہ کہتا تھا۔ میں اس کی طرح بولنے کی کوشش کرتا تو لگتا کہ زم زم جھاگ منہ میں بھر گیا ہے یا میں آئس کریم کھاتے ہوے بول ربا ہوں جس کی ٹھنڈک سے بولنے کے دوران حلق میں گد گدی سی ہونے لگتی ہے۔ میں اس کی طرح بول نہیں سکتا۔ کیا اس کی طرح کھا سکتا ہوں ؟ ایک لمحے کے لیے خیال آیا کہ میں بھی اس طرح مچھلی کھاؤں تو حساب اچھا ہو جائے گا اور میرے لیے بھی میتھے میجک بن جائے گی۔ لیکن یہ خیال میں نے خود ہی ذہن سےجھٹک دیا۔ روٹی کا سوکھا نوالہ جیسے خود بخود حلق میں نہ اٹک جائے۔

فیسٹ کے ختم ہونے کی گھنٹی بجی اور ہم کلاس اسمبلی میں قطار بنا کر کھڑے ہو گئے۔ اس بار فرق اتنا تھا کہ گھنٹی بجنے پر ہمیں کلاس روم میں نہیں جانا تھا جہاں ایک اور مشکل لیسن ہمارا منتظر ہوتا ، بلکہ انتظار کرنا تھا کہ پیرنٹ ٹیچر میٹنگ ختم ہو اور اپنے اپنے امی ابو کے ساتھ ہم گھروں کو جائیں۔ آج امی ابو مسز کننگھم کی باتیں سن رہے ہوں گے ، مجھے خیال آیا اور میں ہنس پڑا۔ میرے آگے عبد الباطن کھڑا ہوا تھا، بالکل جس طرح کلاس میں ڈیسکوں کی ترتیب میں وہ پہلے آتا تھا۔ اس کی امی پہلے باہر آئیں۔ دور سے لگتا بھی تھا کہ وہ اسی کی انی ہوں گی ۔۔ گھر ارنگ اور اصلی مسکراہٹ۔ انھوں نے ساڑھی باندھی ہوئی تھی جس سے شر شر کی آواز آرہی تھی جب وہ لڑکوں کی قطار کے درمیان چلتی ہوئی عبد الباطن کے پاس آئیں۔ وہ اس کے پاس کھڑی ہو کر اسے کچھ بتانے لگیں ۔۔ شاید یہی کہ مسز تھم نے کلاس میں اس کے کام کی تعریف کی ہے۔ لیکن مجھے کچھ اور ہی لگا۔ مجھے ایسا لگا۔۔۔ مجھے ایسا لگا کہ اتوار کی صبح ہے اور ہم بہن بھائی ناشتے کی میز پر بیٹھے انتظار کر رہے ہیں کہ امی باورچی خانے سے پراٹھے لے کر آئیں ۔۔ گرم گرم، تراتراتے ہوئے اور ہاتھ لگانے سے ٹوٹ جانے والے ۔۔ اور اتنے میں ابو نے ریڈ یو سیٹ لگا دیا ہے ۔۔ وی بڑا ریڈیو جس کی آواز سارے کمرے میں گونجتی تھی اور ایک عجیب موسیقی کو پھیلائی جاتی تھی۔ فردوسی رحمن بھٹیالی کا رہی ہیں، ابو ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ہمہ کو بتاتے تھے۔ تیز میٹھی آواز دھوپ کی طرح چڑھتی تو ہم دھن کا ساتھ دینے کے لیے یوں ہی اپنی طرف سے گول مول الفاظ ادا کرنے لگتے : آئیلا گوئے آئیلا گولے ، جیسے میری بیٹی گاتی ہے : موڑ توڑ تھے رانا، اور میں الفاظ درست کرنے لگتا ہوں تو کہتی ہے: یوں ہی ٹھیک ہے ابو، رہتے بھی دیں۔ ( بہت پرانی بات ہو گئی لیکن وہ ڈھن اب بھی میرے ذہن میں گو بہتی ہے ۔ اچھا ہوا اتوار کی چھٹی منسون ہو گئی ، ورنہ ان خستہ پراٹھوں اور فردوسی رحمن کی بھٹیالی کے بغیر اتوار کی صبح کیسے آئی؟ وہ اتوار کی میں نہیں تھی، بنیائی ہی نہیں تھی اور عبد الباطن کی امی فراٹے سے ا سی طرح بول رہی تھیں : آ ئیلاگو لے آ ئیلا گو لے۔ کیا یہ بھی مچھلی کا کمال ہے ؟ مجھے خود ہی اس بات پر ہنسی آگئی تھی۔

وہ کون ہیں، یہ تو مجھے معلوم تھا۔ جس طرح کلاس کے سارے لڑکوں کو ایک دوسرے کا پتا تھا۔ لیکن اس سے فرق پڑے گا، اس کا اندازہ اس دن سے پہلے نہیں ہوا تھا۔ وہ دن یوں بھی مشکل تھا اور ویسے بھی مشکل دن آ گئے تھے۔ امی نے میرا ٹی وی دیکھنا کافی کم کروا دیا تھا ۔۔ ٹی وی پر یوں بھی اور طرح کے تھے بھتے رہتے: ”دیا جلائے رکھنا ہے ، گھر کی خاطر سود کو جھیلیں ، گھر تو آخر اپنا ہے ، " اور جانے کیا گیا۔ لیکن دیا کیوں جلائے رکھیں ، گھر میں کیا بجلی نہیں ہو گی ؟ اور گھر میں کیا ہو گیا ہے جو سب کو بتانا پڑ رہا ہے کہ گھر تو اپنا ہے ؟ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ پہلے سے زیادہ تنگ کر رہا تھا۔ ارتھ پینک پہلے کیا کم تھا کہ الجبر بھی اس ٹرم سے دماغ کو اور الجھانے لگا۔ عبد الباطن کی کاپی اسی فراخ دلی سے کھلی رہتی لیکن وہ مجھے سمجھاتا بھی تھا۔

ایک دن تو اس نے مجھے اپنا راز بھی بتا دیا۔ میتھے میجک کا راز۔ وہ مجھے کلاس روم کے ایک کونے میں لے گیا اور مر گوشی سے تھوڑی بلند آواز میں کھنے لگا ایک گولڈن رول ہے۔ اسے یاد کر لو، پھر زند کی بھر پر علم نہیں ہو گی۔“

" وہ کیا ہے ؟ میرا اشتیاق بڑھتا جا رہا تھا۔

" بوڈماس، اس نے کہا۔

"کیا ؟" میں حیران رہ گیا۔

"ہاں بوڈ ماس۔ میرے ڈیڈی کھتے ہیں یہ یاد رکھ لو، پھر الجبرا کے سوال غلط نہیں ہوں گے۔ بریکٹ، آن ، ڈویزن ، ملٹی پلیکیشن، ایڈیشن، سبسٹریکشن۔ ان کو شارٹ کر لو۔ بوڈاس۔" میں نے سر ہلا دیا جیسے مجھے کسی چھے خزانے کی کلید مل گئی ہو۔ عبد الباطن کا شکر یہ ادا کر کے اپنے ڈیسک پر واپس آیا کہ کاپی پر فوراً نوٹ کر لوں تو مقصود وہاں کھڑا ہوا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر منہ بنا لیا اور آواز دھیمی کرنے کی کوئی کوشش کیے بغیر کہا: ''وہ غدار ہے ۔ اس سے دوستی ختم کر دو۔ "

کچھ کچھ سمجھتے ہوے بھی میں ان جان ہنستے ہوے پوچھنے لگا : کیا بات ہے ؟ کس کو کہہ رہے ہو ؟ "

مقصود کوئی جواب دیے بغیر چلا گیا۔ میں نے عبد الباطن کی طرف دیکھا کہ اس نے سن تو نہیں لیا۔وہ سر جھکائے اسی طرح کا پی پر سوال حل کر رہا تھا۔

کچھ ہونے والا ہے ، میرا دل زور سے دھڑکا۔ میری سمجھ میں کچھ کچھ آ رہا تھا لیکن پوری طرح نہیں۔ دماغ یا الجھا کہ اگلے دن بوڈاس بھی کتنی دیر بعد : کتنی دیر یاد آیا۔ اس وقت تک کلاس ورک کا ٹائم ختم ہو رہا تھا۔ مر معظم نے پھر مجھے بات ٹائم میں ڈیٹنشن دے دیا۔ باقی سارے بڑے کے باہر جاچکے تھے، میں ڈیسک پر میٹھا سوال میں مغز کھپا رہا تھا۔ سامنے والا ڈیسک خالی پڑا تھا۔ مر مم مور لنگ نیوز سامنے بچھا کر گیٹ اے ورڈ کا کراس ورڈ حل کر رہی تھیں۔ اک بار کی کلاس روم کے سامنے شور سا سنائی دیا۔ میں نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا۔ کلاس کے بہت سارے لڑکے ایک جگہ جمع تھے۔ میں تیر کی طرح بھاگا اور وہاں پہنچ گیا۔

کلاس کے لڑکے دائرہ بنائے ہوے تھے اور ان کے بیچوں بیچ جو کھڑا تھا وہ عبد الباطن تھا۔

" یہ غدار ہے، " مقصود نے مجھے بتایا۔ ” یہ دشمن ہے۔ میرے ابو اور ان کے فرینڈز کھتے ہیں یہ سب لوگ ہیں ہی ایسے۔ یہ بلیک آؤٹ نہیں کرتے۔ یہ راتوں کو اپنے گھر کی چھت پر ٹارچ جلا کر دشمن کے جہازوں کو اشارے کرتے ہیں۔۔۔"

میں نے عبد الباطن کی طرف غور سے دیکھا۔ اس کا رنگ اور زیادہ گھر الگ رہا تھا اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں تھی۔

"غدار ہے غدار۔۔۔!" لڑ کے دہرار ہے تھے۔

مقصود ایک لفظ کھتا اور باقی سب لڑکے اسے دہراتے۔ بنگالی با بو آیا ، " وہ گیت سا بن گیا تھا۔ بنگالی بابو آیا، مرغی کچرا کر لایا۔ ” اس گیت کی تے پر سب تالیاں بجا ر ہے تھے۔ مرغی نے مارا پنجہ ، بنگالی بابو گنجا۔ اور گنجا کے لفظ کے ساتھ ہی زناٹے کے تھپڑ کی آواز جو اپنے ہاتھ اوپر کر لینے کے باوجود عبد الباطن اپنے سر پر پڑنے سے بچا نہیں سکتا تھا۔

" بنگالی با بو آیا۔۔۔ تم بھی کہو " مقصود نے مجھے ٹہوکا دیا۔ پھر خود ہی رگ گیا۔ عبد الباطن کے چہرے سے زیادہ اس کی پتلون بھیگ رہی تھی۔

"شیم شیم گندا گندا شیم شیم، "مقصود زور زور سے دُھرا رہا تھا اور سب لڑکے تالیاں بجا رہے تھے۔ ہم حلقے میں گھوم رہے تھے اور عبدالباطن درمیان میں کھڑا تھا۔

"واٹ نان سنس۔۔۔"مسز کننگھم کے ڈانٹ کی آواز آئی تو ہم سب چونکے ۔"یوکتاز! یو اُلو ز !" وہ اپنے مخصوص انداز میں ہم پر برس رہی تھیں لیکن اُن کے آنسو نکلے چلے آرہے تھے، اور ان کا چہرہ عبدالباطن کی پتلون سے زیادہ گیلا لگ رہا تھا۔

اس دن کے بعد عبدالباطن اسکول نہیں آیا۔ بعد میں کسی سے سنا کہ وہ اپنے امی ابو کے ساتھ چلا گیا ہےکیوں کہ ان کا ملک الگ ہوگیا ہے۔

بوڈماس مجھے اب بھی یاد ہے، حالاں کہ میری زندگی میں کوئی خاص کام نہیں آتا۔ لیکن ایک بات ایسی ہے جو میری سمجھ میں نہیں آتی۔۔۔

ڈیٹینشن کی سزا تو ساری کلاس کو ملی تھی اور مسز کننگھم نے فادر پنٹو سے شکایت کی تھی اور انھوں نے آکر کتنی دیر ہم کو پیار سے سمجھایا تھا، ڈانٹا تھا، دھمکایا تھا، معافی بھی منگوائی تھی۔۔۔ تو پھر اب کیوں بیٹھے بٹھائے گھبراہٹ طاری ہوجاتی ہے۔۔۔ جیسے میں اسی ڈیسک پر بیٹھا ہوں اور مسز کننگھم سزا دینے کےلیے آوازیں گی:"نیکسٹ!"

کیا اب میری باری آگئی ہے؟ میں اس ڈیسک پر بیٹھا ہوا ہوں اور ڈر کے مارے میرےپیٹ میں درد ہور ہا ہے۔

اور میں اس وقت تک سہما رہوں گا جب تک میری باری نہ آجائے۔

٭٭

**انور خاں**

ـــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــ

**بسر ہوسکے تو بسر کیجیے**

ناشتہ کر رہا تھا کہ پھر فون آیا۔ چونگا والد صاحب نے اٹھایا۔ ہنس روڈ سے رمیش بھائی کا فون تھا۔ رمیش بھائی سوشل ور کر ہیں اور بڑھی تن دہی سے کام کرتے ہیں۔ اپنے علاقے کی بہبودی کا انھیں بڑا خیال رہتا ہے۔ لوگ کھتے ہیں کہ چند ماہ بعد اسمبلی انتخابات ہونے والے ہیں اس لیے ان دنوں وہ کچھ زیادہ ہی سرگرم ہیں۔ بہر حال ، وجہ جو بھی ہو، کم از کم اپنے علاقے کے لوگوں کے کام تو آتے ہیں۔ ویسے بھی آج کل بے غرض کوئی کام نہیں کرتا۔ اور کرے بھی کیوں۔ اب ہماری سوچ بدل گئی ہے۔ اب تو ہم خود نہیں چاہتے کہ کوئی بے غرض ہمارا کام کرے۔ اس میں ہمیں سبکی محسوس ہوتی ہے۔ کام کرے اور اپنا پیسہ لے۔ وہ اپنے گھر خوش، ہم اپنے گھر خوش۔ ہاں ، رقم جیب پر زیادہ گراں نہ ہو۔ فسادات کے بعد یہ ان کا چھٹا یا ساتواں فون تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ تم ہنس روڈ پر اپنی ڈسپنسری پھر شروع کریں جو فسادات کے دوران بری طرح توڑ دی گئی تھی۔ لفنگے دروازے تک نکال کر لے گئے تھے۔

وہاں زیادہ تر لوگ غریب ہیں۔ جھونپڑیاں بہت ہیں، بلکہ بعض جگہ تو زمین میں گھرے گڑھے کھود کر ایک منزلہ جھونپڑیاں بنائی گئی ہیں۔ چلتے چلتے دفعتاً زمین کی سطح پر آ نکھیں، چہرے رکھے ہوے نظر آتے ہیں اور انسان میرا بڑا جاتا ہے۔ برسات میں پانی بھر جاتا ہے۔ مچھروں کی تعداد انسانوں سے بڑھ جاتی ہے۔ خلافت کے انبار ہر طرف جمع رہتے ہیں۔ ہفتے میں دو ایک بار صفائی والے آتے ہیں : نصف غلاظت اٹھاتے ہیں، باقی اسی طرح چھوڑ دیتے ہیں ۔ دو روز بعد پھر وہی انبار جمع ہو جاتا ہے ۔ جابجا کسی اسلامی تنظیم نے صفائی نصت ایمان ہے کے پوسٹر کار ہیں۔ مچھروں اور خلافت کی وجہ سے لوگ آئے دن بیمار رہتے ہیں۔ میری ڈسپنسری وہاں خوب چلتی تھی۔ تانتا بندھا رہتا تھا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں آوروں سے کم پیسے لیتا تھا۔ مجھے پتا ہے یہ غریب لوگ زیادہ پیسے نہیں دے سکتے ۔ والد صاحب نے مجھے ڈاکٹر اسی خیال سے بنایا ہےکہ میں خلق خدا کی خدمت کروں اور دنیا عقبیٰ دونوں سدھر جائیں۔ وہ خدا ترس انسان ہیں۔ پر ہیز گار، نمازی۔ ہماری پشتینی کپڑوں کی دکان ہے، اس لیے مالی آسودگی ہے۔ ان کی وجہ سے ہمارے گھر کا ماحول بھی کچھ ٹھیک ٹھاک ہے۔ ایسی ہائے واللہ نہیں جیسی اور گھروں میں آپ دیکھتےہیں۔

والد صاحب ڈسپنسری دوبارہ شروع کرنے پر رضامند نہیں۔ پہلے ہی ہمارا پچاس ہزار کا فرنیچر تباہ ہو چکا ہے۔ وہ دوبارہ رِسک نہیں لینا چاہیتے۔ رمیش بھائی کے اصرار پر والد صاحب چونگا مجھے پکڑا دیتے ہیں۔ رمیش بھائی کا کہنا ہے کہ ٓس پاس کے ڈاکٹر ایک تو فیس دُگنی لیتے ہیں، دوسرے کئی دن تک دوا جاری رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان پیتھولوجیکل لیبارٹریوں سے بھی کمیشن بندھا ہوا ہے۔ مریض کو آئے دن کسی نہ کسی ٹیسٹ میں اُلجھائے رکھتے ہیں، اور سیکڑوں روپے یوں ہی نکل جاتے ہیں۔ ان لوگوں کے درمیان کام کرتے ہوئے اُنسیت سی ہو گئی تھی، اس لئے میں خود وہاں دوبارہ جانا چاہتا ہوں۔ لیکن ایک اندیشہ یہ بھی ہے کہ ایسے غنڈے جو سوشل ورک کے نام پر سفید پوش بنے ہوئے ہیں، شاید میری واپسی کو پسند نہ کریں۔ اطراف کے ڈاکٹروں سے وہ نذرانے وصولتے رہتے ہیں، اور ڈاکٹر برائے عافیت خاموشی سے ان کا منھ بھرتے رہتے ہیں بلکہ ایسا ظاہر کرتے ہیں، کہ وہ اپنی خوشی سے دے رہے ہیں ۔ ان سوشل ورکروں کو دوادارو، میڈیکل ٹیسٹ سب فری ہوتے ہیں۔ اگر میں واپس گیا تو یہ سوشل ورکر ممکن ہے ان ڈاکٹروں کی خاطر پھر کوئی ٹنٹا کھڑا کر دیں۔ اس لئے رکا ہوا ہوں، ورنہ چلتی ہوئی پریکٹس سے کون منھ موڑ سکتا ہے۔ میں نے حسبِ سابق غور کرنے کا وعدہ کر کے فون منقطع کردیا۔

ڈسپنسری کا وقت ہو رہا تھا۔ نیچے آیا تو پان کی دکان پر طاہر بھائی سے ملاقات ہو گئی۔ طاہر بھائی کسی دفتر میں کلرک ہیں اور شوقیہ ہومیوپیتھی کرتے ہیں۔ مذہبی خیالات رکھتے ہیں۔

آج آپ دفتر نہیں گئے ؟ میں نے پوچھا

ہاں، آج چھٹی ہے۔

تو آئیے ڈسپنسری چلیں، میں نے کہا کچھ گپ شپ رہے گی۔

آپ کی یہ نئی ڈسپنسری معلوم ہوتا ہے ابھی جمی نہیں، طاہر بھائی مسکرائے۔

ہاں یار، ایسا سمجھو اُجڑی گر ھستی پھر سے بسا رہا ہوں۔

طاہر بھائی یہ خوشی ساتھ ہو لیے۔ انھیں علاج معالجے کی باتوں میں بڑا لطف آتا ہے اور چاہتے ہیں کہ ڈاکٹروں سے زیادہ سے زیادہ تبادلہ خیال کریں۔

پلیگ کے بارے میں آپ کا کیا کیال ہے؟سگنل پر گاڑی رکی تو یوں ہی گفتگو کی خاطر میں نے پوچھا۔  
"پلیگ ایک دہائی بیماری ہے۔ جب افراد فطرت کے قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو بیمار ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح انسانوں کا کوئی گروہ جب زیادتیوں میں حد سے گزر جاتا ہے تو وبائی بیماریاں پھیلتی ہیں۔"

" یہ تو مذہبی نقطہ نظر ہوا، "میں نے کہا۔

"یہی تو ہمیں ایلو پیتھی سے اختلاف ہے، ” طاہر بھائی نے کہا۔ آپ لوگ صرف علامات کو دبا دیتے ہیں، بیماریوں کو دفع نہیں کرتے۔ اس لیے ایک شکایت دور ہوتی ہے تو دوسری شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔"

اور ہومیو پیتھی میں کیا ہوتا ہے ؟ " ہری روشنی دیکھ کر میں نے گاڑی بڑھائی۔

" ہومیو پیتھی روح کا علاج کرتی ہے ، " طاہر بھائی نے کہا۔ ”جب روح میں ڈسٹر ہنس پیدا ہوتا ہے تو جسم پر بھی اس کے اثرات نمایاں ہوتے ہیں۔ ہم اس ڈسٹر بنس کا پتا چلانے کی کوشش کرتے ہیں اور اسی کی مناسبت سے دوا دیتے ہیں۔ اسی لیے بے حد معمولی مقدار میں ہونے کے باوجود دوا اثر کرتی ہے، اور بعض اوقات ایک یا دو خوراکوں سے ہی مرض اچھا ہو جاتا ہے اور پلٹ کر نہیں آتا۔"

شاہراہ سے گلی میں گاڑی موڑتے ہوے میں نے دیکھا کہ وہاں خاصی بھیڑ ہے اور دس پندرہ جوان ہاتھوں میں لاٹھیاں لیے کھڑے ہیں۔"

"کیا پھر لفڑا ہوگیا،"طاہر بھائی نے تشویش سے کہا۔

گاڑی گلی میں موڑ نے کے بجاے میں شاہراہ پر آگے بڑھ گیا اور پھر اگلے موڑ سے گاڑی گھماتے ہوے نسبتاً طویل راستے سے ڈسپنسری پہنچا ۔ وہاں جھگڑے کے کوئی آثار نہ تھے۔ ہر چیز حسب ِ معمول تھی۔ ڈسپنسری کھلی تھی اور کمپاؤنڈر اخبار دیکھ رہا تھا۔

"کچھ گڑبڑ ہےکیا؟" طاہر بھائی نےا س سے پوچھا۔

"نہیں تو۔ آپ ایسا کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"ابھی ہم آر ہے تھے تو اپنی گلی کے سرے پردس پندرہ آدمی لاٹھیاں لیے کھڑے تھے۔"

"وہ کمپانڈر ہنس پڑا۔"وہ چوہے مار رہے ہیں!"

"چوہے مار رہےہیں؟" مجھے بھی حیرت ہوئی۔

"ہاں ساب ، وہ سُورت میں پلیگ پھیلا ہے نا۔ یہاں نہ پھیل جائے اس لیے۔"

"اوہ!" ہم ہنس پڑے۔ تناو اور الجھن سے نجات ملی جس نے پریشان کر دیا تھا۔

مجھے انکل مُوش کا خیال آیا۔ انکل موش انتہائی لاغر ، کچھ فلسفی قسم کے عمر رسیدہ چوہے ہیں جنہوں نے برسوں سے ہماری کتابوں میں ڈیرا جما رکھا ہے۔ کبھی کئی کئی دن نظر نہیں آتے، پھر اچانک کچن ٹیبل پر، کھڑکی میں کپ بورڈ کے نیچے ٹہلتے ہوے یا کسی گوشے میں مراقبہ کرتے ہوے دکھائی دے جاتے ہیں ۔ شروع میں ہم نے ان کے پری نروان کی بہت کوشش کی؛ طرح طرح کے پنجرے استعمال کیے۔ ہم ذرا غافل ہوے کہ پھر سینے پر مونگ دلنے کو موجود ۔ کئی بار ایسا ہوا کہ رات کو آنکھ کھلی۔ رات کے سناٹے میں کتاب کتر نے کی آواز سن کر ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی دل کتر رہا ہو ۔ گھبرا کر اٹھے ۔ بتی جلائی۔

کپ بورڈ تھپ تھپا یا ۔ ڈنڈے بجائے ۔ دو چار منٹ خاموشی رہی۔ ادھر ہم بتی بجھا کر لیٹے اور کتاب کترنے کی آواز پھر شروع ہو گئی۔ کئی بار نیند ہی اچٹ گئی۔ بستر پر لیٹے لیٹے سوچتے رہے، پتا نہیں کون سی کتاب کتر رہا ہے۔ انکل موش سے لڑائی مہینوں چلی۔ وہ اتنے ہوشیار اور سخت جان ثابت ہوے کہ ہمیں ی ہتھیار رکھنے پڑے۔ کبھی کبھی یوں محسوس ہوا کہ انکل پرانے صوفیا کی طرح انتہائی قلیل غذا پر گزارا کرتے ہیں ، اور وہ قلیل غذا ہماری کتابیں ہیں، کیوں کہ انکل اس قدر نحیف و نزار ہیں کہ تیزی سے دوڑ نہیں پاتے۔ کئی بار چاہا کہ خوب کس کر جو تا رسید کروں کہ وہیں ڈھیر ہو جائیں۔ لیکن ہمارا نشانہ اس قدر الل ٹپ کہ انکل موش نے اس سے زیادہ کبھی نہیں کیا کہ تاسف بھری نگاہ ڈال کر میز کے پیچھے روپوش ہو جائیں ۔ بیوی بچوں کو ان سے کہ نہیں ، کہ وہ انکل موش سے زیادہ ہماری کتابوں کے دشمن ہیں ، اور خوش ہیں کہ انکل کو کتابوں سے اس قدر عشق ہے۔ بیگم کو اس بات کی بڑی شکایت ہے کہ ہمارا سارا وقت تو باہر گزرتا ہے۔ جو تھوڑا بہت وقت گھر پر میسر آتا ہے وہ ان مائی ملی کتابوں میں سر کھپانے میں چلا جاتا ہے۔ چڑانے کے لیے ہماری بیوی صبا نے اس نابکار چوہے کا نام انکل موش رکھ دیا ہے۔ کھلتے ہیں کہ دشمن پرانا ہو تو اس سے ایک گونہ تعلق پیدا ہو جاتا ہے ۔ ہمارا اور انکل موش کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے ۔ تم دونوں جیسے ایک دوسرے کے خیالات جان لیتے ہیں، بلکہ ہمارے درمیان ایک خاموش سی مفاہمت ہو کھی ہے۔ ہم نے انکل کو ختم کرنے کا ارادہ ترک کر دیا ہے اور خود کو اس بات سے تسلی دے لیتے ہیں کہ بہرحال دنیا دارالفنا ہے، انکل کو بھی ایک دن جانا ہے۔ ادھر انکل موش بھی انھیں کتابوں پر دانت لگاتے ہیں جنہیں ہم مدت ہوئی فرا موش کر چکے ہیں اور محض اس لیے رکھ چھوڑی ہیں کہ شاید کبھی ان کی ضرورت پڑے۔جیسے ایک دن کسی کتاب کو تلاش کرتے ہوے ہم نے مچان پر رکھے ٹیبل کی دراز کھولی تو دیکھا یوسف القر ضاوی کی کتاب "اسلام میں حلال و حرام " کے اردو ترجمے کے قریب تیس چالیس صفحات صفاجٹ چٹ اور باقی صفحات پر دنت کتھا لکھی ہوئی ہے۔ چینی نظموں کے انگریزی ترجموں کا ایک عمدہ، خوب صورت انتخاب ہاتھ آیا تھا۔ سوچا تھا کسی مناسب موقعے پر تحفہ دینے کےلیے موزوں ہے۔ لیکن انکل موش نے اس کے گردپوش اور جلد کی سلائی کی اس صفائی سے دندانٰ کاری کی کہ کتاب پوری خراب نہیں ہوئی لیکن بطور تحفہ دینے لائق بھی نہیں رہی۔ شاید انکل پسند نہیں کرتےکہ ہم مفت ہاتھ آئی کتاب کسی کو تحفے میں دیں۔

"یہ بات تو اچھی ہے کہ انسانوں کو چوہوں کی طرح مارنے کے بجاے چوہوں کو چوہوں کی طرح مارا جا رہا ہے، "میں نے طاہر بھائی سے کہا۔

" ہرے سانپوں کو مارنے سے یہ یقنا بہتر ہے، "طاہر بھائی نے جواب دیا۔"چوہے کئی ہزار ملین ٹن اناج کھا جاتےہیں۔"

"یہ مہم اپوزیشن والوں نے چلائے ہوتی تو آج اقتدار کی دیوی ان پر مہربان ہوتی۔"کمپاؤنڈر نےکہا ۔

"ہاں ، یہ تو ہے،"میں نے تائید کی۔

چاے منگوائی گئی۔ اس دوران دو مریض آگئے۔ طاہر بھائی چاے پی کر نکل لیے اور ہم مریضوں کے ساتھ مصروف ہوے۔ انھیں نمٹا کر بیٹھے ہی تھے کہ ایک نوجوان تیزی سے اندر آیا اور ایک کاغذ پکڑا کر اسی تیزی سے واپس چلا گیا۔ چھوٹا سا ہینڈبل تھا: "طاعون اور اسلام"۔

"بمبئی نگر کی ہر ڈگر میں ایک خبر ہے۔ گھر گھر میں ایک ڈر ہے۔ کسی نے دوا پر، کسی نے تعویذ پر بھروسا کیا اور دعاؤں کو دروازوں پر چسپاں کر لیا تاکہ طاعون سے بچ جائے۔ یہ بھی نہ سوچا کہ یہ عمل میرے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے یا نہیں۔ شرک و بدعت تو نہیں کہ عیاذ باللہ جہنم تک لے جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان تو یہ ہےکہ موت مومن کےلیے تحفہ ہے۔ مومن کا طاعون میں مرنا شہاد ت ہے۔

"غور کرنے کی بات یہ ہےکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یا کسی صحابی یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ ان لوگوں میں سے کسی نے یا اللہ کے رسول نےہدایت کی ہوکہ کسی نے یا اللہ کے رسول نے ہدایت کی ہو کہ کسی تعویذ یا دعا کادروازے پر چسپاں کرنا یا قرآن خوانی یا آیت کریمہ کی مجلس لگانا، جو بدعات ہیں، بجائے اللہ کو خوش کرنے کے ناراض کرتے ہیں۔ بدعت کے بارے میں فرمان رسول ہے کہ جس نے دین کے اندر کوئی نئی بات ایجاد کی وہ مردود ہے (بخاری و مسلم ) ۔ اللہ تعالیٰ بدعتی شخص کا نہ روزہ قبول کرتا ہے نہ نماز نہ حج نہ عمرہ نہ کوئی نفلی عبادات۔ بدعتی شخص تو اسلام کے اندر سے ایسا نکل جاتا ہےجس طرح گوندھے ہوے آٹے سے بال نکل جاتا ہے۔ (ابن ماجہ)

"طاعون سے آپ نےپناہ نہیں مانگی ، اس کا یہ مطلب نہیں کہ موت کے منھ میں کودنے کو کہا ہو۔ اسلام حکمت اور طفرت سلیمہ والا مذہب ہے۔ طاعون سے نہ بھاگنے میں دو حکتیں ہیں۔ (1) موت برحق ہے۔ آپ کہیں بھی رہو، اپنی وقت پر آکر رہی گی۔ مسلمانوں کو کسی بھی حال میں گھبرانا نہیں چاہیے۔(2) گھبرانے اور ڈرنے سے جسم کی بیماری سےلڑنے کی قوت ختم ہوجاتی ہے اور بے فکری جسم کو قوی رکھتی ہے۔ لیکن آج رسول کے امتی اس شہادت کی موت سے بھاگتے ہیں۔ ہائے افسوس نبی سے عشق کا دعویٰ رکھنے والوں ! اللہ سے ملاقات سے گھبرا تے ہو؟ آخر میں یہ ضرور جان لیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ جب بھی کوئی آفت آتی فوراً نما ز کی طرف متوجہ ہوتے اور یہے تعلیم ہمارے لیے بھی ہے۔ یہی ہماری نجات کا سبب ہے اور جنت کی کنجی ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو دین حق پر عمل کرنے کےساتھ ساتھ اس پر ثابت رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

"فرمان رسول پہنچا دو میری طرف سے اگر آیت ہی ہو (بخاری )

"حسین الحق ۔ "3182089"

پڑھنے کے بعد ندامت ہوئی کہ خوف ایک بشری تقاضا ہے، اور اسی تقاضے کی بنا پر ہماری بیگم نے طاعون اور وبائی امراض سے بچنے کی دعا جو گھر گھر تقسیم ہو رہی تھی ، دروازے پر چسپاں کردی تھی۔ اور انھیں ہماری خاموشی تائید حاصل تھی کہ ایسے موقعوں پر کون چانس لیتا ہے۔

دو چار روز انکل موش نظر نہیں آئے۔ بچی نے یاد دلایا تو تشویش لاحق ہوئی۔ بیگم نےکہا:

"خدا نخواستہ۔۔۔"

" یہ کیا اُپ شگون ہے !" ہم نے فوراً ٹوکا۔ انکل موش اَمر ہیں۔"

آخر ش کئی روز بعد دیدار ہوے۔

دیکھا انھیں جو آج تو جی سن سے ہوگیا

سمجھے تھے ہم کہ ہو کے جدا خیریت سے ہیں

سانس بھی مشکل سے لے پا رہےتھے۔ شاید گٹروں میں اور فٹ پاتھوں پر کثرت سے چھڑکی گئی دوا کا اثر تھا۔ دو روز سے خود ہمیں جینا دو بھر ہو رہا تھا۔ بیچارے انکل موش بہ مشکل کھلی ہوا میں آئے تھے ۔ آنکھوں سے ٹپکتی بے کسی نے کلیجا چیر کر رکھ دیا۔ لیکن ہم کیا کر سکتے تھے۔ سیکڑوں میل دور چند جنگلی چوہوں کی ڈہائی آفت نے تمام چوہوں کی جانیں خطرے میں ڈال دی تھیں، ورنہ ہم انسان جس قدر چاؤ سے چوہوں کی پرورش کرتےہیں انسانوں کی بھی نہیں کرتے۔ دیر تک وہ کھلی ہوا میں لمبی لمبی سانسیں لیتے رہے۔پھر ڈگمگاتے لڑکھڑا تے میز کے پیچھے روپوش ہوگئے۔

اُس رات انکل موش میرے خواب میں آئے۔ بہت ناراض تھے اور پریشان۔

"اس سے تو اچھا تھا کہ میں تمھارے ہاتھوں جام شہادت نوش کر لیتا ۔"ان کےلہجے میں تلی تھی۔

مجھے آپ سے ہم دردی ہے، لیکن میں کیا کر سکتا ہوں انکل موش۔"

"تم انسان انتہائی خبیث ہو،"انہوں نے کہا۔ "غلاظت خود پھیلاتے ہو، سزا چوہوں کو دیتے ہو۔"

"آپ سچ کہہ رہےہیں، "میں نےکہا، "لیکن انکل ، ہماری حالت تو چوہوں سے بھی بدتر ہے۔ آپ پہلی بار زد میں آئے ہیں؛ ہماری جان تو سدا آفت میں رہتی ہے۔"

"لیکن یہ لوگ تو چوہوں کی پوری نسل کو ختم کرنے پر تلے ہیں، "انکل موش نے فکر مند لہجے میں کہا۔

"اس کی آپ فکر نہ کریں،"میں نے تسلی دی۔"یہ صفائی دس پندرہ روز سے زیادہ نہ رہے گی۔

آپ نے تو ہمارے معاشرے کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ "مجھے اپنی عمرانیات کی کتاب یاد آئی انکل موش جس کا ایک ایک ورق چاٹ گئے تھے۔

"یہ تم ٹھیک کہتے۔"ان کے چہرے پر رونق آئی، جیسے بجھتا ہوا دیا بھڑک اٹھتا ہے۔ "واقعی تم لوگ اس قدر سڑ چکےہو۔ تمھارے آس پاس پھیلی غلاظت کبھی کم نہ ہوگی بلکہ بڑھتی جائے گی۔ یہ ہرطرف پھیلا تعفن تمھارے اندرون ہی کا تو ہے جو اتنا سڑچکا ہے کہ پیک کی شکل میں چاٹ رہا ہے۔"

مجھے غصہ آگیا۔

"کیا آپ یہی بتانے کےلیے آئے ہیں؟" میں نے زِچ ہوکر کہا۔

ٹھیک ہے، اب میں جاتا ہوں ، "انکل موش نے کہا۔ ” اب ہماری ملاقات خوابوں میں ہو گی۔" اگلی صبح ناشتہ کرتے ہوے میں نے دیکھا، انکل موثر کھڑکی کی منڈیر پر پڑے الٹی سیدھی سانسیں لے رہے ہیں۔ مجھے ان پر رحم آیا۔ ان کی مشکل آسان کرے کے خیال سے میں نے ایک لکڑی اٹھائی اور ان کی طرف بڑھا۔ وہ مجھے مایوس نگاہوں سے دیکھتے رہے، لیکن بھاگنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے ہلکی سی ضرب لگائی۔ وہ بغیر چُوں کیے وہیں ڈھیر ہوگئے۔ چمٹے سے ان کے ضعیف بدن کو اٹھا کر گٹر میں پھینکنے ہی والا تھا کہ اخباروں میں چھپی ہدایت یاد آئی۔ تھوڑا سا گھاسلیٹ چھڑک کر ماچس کی تیلی دکھا دی۔

پھر جو دیکھا کچھ نہ تھا جز شعلہ پر پیچ و تاب

رات دو بجے اچانک آنکھ کھلی۔ ایسا لگا جیسے ا نکل موش رو رہے ہوں میرے دل کو کوئی مسل رہا تھا۔ میں کروٹیں بدلنے لگا ۔ پانچ منٹ بھی نہیں ہوئے ہوں گے کہ صبا اٹھ بیٹھی۔

" آپ رو رہے ہیں؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

میں رو رہا ہوں؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اس نے حیرت سے پوچھا۔

میرا تکیہ گیلا تھا۔

"شاید آپ کوئی خواب دیکھ رہےتھے،"صبا نے کہا۔

میں تکیہ پلٹ کر پھر لیٹ گیا۔ لیکن نیند آنکھوں سے غائب ہوچکی تھی۔ اگلے روز میں نے رمیش بھائی کو فون کیا۔ انھیں اطلا ع دی کہ میں ڈسپنسری کھول رہا ہوں ۔ وہ کسی مناسب کاریگر کو بھیجیں جو ایک بار پھر ڈسپنسری ٹھیک ٹھاک کردے ۔ دروازے بھی نئے لگانے ہوں گے۔

رمیش بھائی بہت خوش ہوے۔ فوراً کسی بااثر شخصیت سے ڈسپنسری کا افتتاح کرانے کا پروگرام بنانے لگے۔دو منٹ بعد میں نے طاہر بھائی کو فون کیا۔ میں انھیں اطلاع دی کہ میں اپنی ہنس روڈ والی ڈسپنسری شروع کر رہا ہوں، لیکن صرف صبح کے اوقات میں۔ وہ چاہیں تو شام کے اوقات میں وہاں اپنی ہومیو پیتھی کی پریکٹس کر سکتے ہیں۔ وہ خوش ہوے اور اس تجویز پر غور کرنے کے لیے چند روز کی مہلت چاہی۔

ایک ہفتے بعد پرکاش کا فون آیا جو اس تنظیم کی جسے فسادات میں استعمال کیا گیا ، علاقائی شاخ کا سربراہ ہے۔ اس نے یقین دلایا کہ میں بے خوف و خظر ڈسپنسری شروع کردوں ، وہ حفاظت کی گارنٹی لیتا ہے۔

" مسٹیک ہوگیا ڈاکٹر ساب،" اس نے کہا۔ " اپن کو بعد میں سب لوگ بولا آپ بہوت اچھا آدمی۔ غریب لوگ کا مدد کرتا ہے۔ پھر مت کرنا۔ میں اپنا آدمی بھیجتا ہے۔ وہ آپ کا ڈسپنسری فسٹ کلاس بنا دے گا، ایک دم چکاچک ۔ پہلے سے بھی ایک دم اچھا۔ سارا کھر چا اپن کرے گا۔ اس کے بعد اپن کُھود اس کا اُدگھاٹن (افتتاح) کرے گا۔ یہ سالا پولیٹکس بہوت گندا چیج ہے۔ سب دھندے کا بت ہے نئیں تو اپن بھید بھاؤ کرنے والا آدمی نئیں۔ میرے پاس بہوت مسلمان ہے۔ اپن سب کا کھیال رکھتا ہے۔ کیا میں کھودا دکھاٹن کے واسطے آئے گا۔ ہندو مسلم یونٹی ہے کہ نئیں۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کر کے فون رکھ دیا۔

٭٭

**نکہت حسن**

ــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــ

**جاگِنگ پارک**

"چالیس منٹ برسک واک اور کنٹرو ولڈ ڈائٹ ، "ڈاکٹر آندھرے جو اپنی آرام کرسی پر بیٹھے ہوے تھے اور زبیدہ کے الٹرا ساؤنڈ اور بلڈ رپورٹ کو بڑی دیر سے دیکھ رہے تھے، بولے۔

زبیدہ ان کے سامنے ٹٰن کے ایک تکلیف دہ اسٹول پر بڑی بے آرام سی بیٹھی ہوئی تھی اور سوچ رہی تھی کہ آخر یہ ڈاکٹر حضرات مریضوں کے بیٹھنے کےلیے اس قدر تکلیف دہ اسٹول کیں استعمال کرتے ہیں۔ یہ بھی شاید انکی پالیسی میں شامل ہے، تاکہ مریض جب اس اسٹول سے آٹھے تو اپنے امراض میں مزید ایک مرض کا اضافہ کر کے اٹھے : خونی بواسیر۔

برسک واک اور ڈائٹ کا مشورہ دینےکے بعد انھوں نے رپورٹس زبیدہ کی طرف بڑھائیں اور پھر بولے:

"سب ٹھیک ہے۔ معمولی سے لپڈس بڑھے ہوے ہیں۔ یورک ایسڈ بھی ٹھیک ہے۔ پیشاب کی رپورٹ بھی درست ہے۔ میموگلوبن بھی تیرہ ہے، یعنی بہت بہتر ۔ کلسٹرول بڑھنے کا اندیشہ ہے۔ فی الحال تو وہ بھی ٹھیک ہے۔ البتہ آپ کا وزن زیادہ ہے۔ اس کو برسک واک اور ڈائٹ سے ہی کنٹرول کیجے ۔یہی آپ کا علاج اور یہی دوا ۔"

"اور وہ دم گھٹنا!" زبیدہ ہکلائی اور پھر بولی:

"ڈاکٹر صاحب، میرا گلا بالکل بندہو جاتا ہے۔ زبان کٹنے لگتی ہے۔ ناک میں سڑ سڑ ، گلےمیں خر خر ۔ انسونیا۔ تھوڑا کھا کر بھی بھاری پن کا احساس ۔ پھر یہ سب کیا ہے؟"

"وہم ! جس کا علاج حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں ، "ڈاکٹر صاحب نے بے پروائی سے کہا۔

"میں تو اپنے گھر میں سارا دن چلتی ہوں۔ گھر کا سب کام خود ہی کرتی ہوں،"وہ پھر بولی۔

"کام آپ کے بے شک نہ کریں۔ گھر میں سارا دن بیٹھی بھی رہیں۔ لیکن دن کے کسی بھی وقت باہر نکل کر چالیس منٹ کی برسک واک آپ کا واحد علاج ہے۔" ڈاکٹر صاحب نے گھنٹی بجا کر دوسرے مریض کو طب کیا۔

زبیدہ غصے سے پیر پٹختی ہوئی ڈاکٹر کے کمرے سے نکلی۔ وہ خود ہی خود بول رہی تھی:" ایک ہزار روپے رپورٹس پر خرچ ہوے، چار سو روپے فیس کےلےلیے ، اور علاج کیا بتایا، برسک واک!"

اس شہر میں رہنے والی گھریلو عورتوں کو باہر نکل کر برسک واک کا مشورہ دے رہے ہیں! بالکل ہی سٹھیا گئے ہیں۔ سڑک پر دہشت گردی اور ڈاکوؤں کے روہ۔ گلیوں اور محلیوں میں کلاشنکوف تھامے ہوے رینجرز۔ کا نوں کے پردے اڑا دینے والی گولیوں کی آوازیں ۔ انسانی لاشوں کے خون سے لت پت سڑکیں۔ اور پھر اس ریگستان میں کون سے پارک اور باغ ہیں جہاں جا کر کوئی شریف عورت برسک واک کرے؟ یہ بھی کوئی اپنا خیرآباد ہےجہاں میلوں پھیلا ہوا لالا ٹکی مل کا ہر ا بھرا باغ تھا جہاں جوہی اور مولسری ایک ساتھ کھیلتے تھے، جہاں فضاؤں میں گھاس اور تازہ پھولوں کی مہک تھی، جہاں چڑیوں اور پرندوں کی چکاریں تھیں۔۔

یہ پیاری پیاری چڑیاں پھرتی ہیں جو چہکتی

قدرت نے تیری ان کو تسبیح خواں بنایا

اور جہاں لالہ کی پر نانی یا سگڑنانی، جن کو چڑیو ں اور پرندوں کے ساتھ رہتے رہتے ایک عرصہ ہوگیا تھا اور جو ان چڑیوں اور پرندو کی زبان بھی سمجھنےلگی تھیں، مولسری کے درخت کے نینچے گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی رہیت تھیں۔۔

سلیماں سر بہ زانواور سبا ویراں

وہاں چالیس منٹ تو کیا، انسان سارا دن چل سکتا تھا۔ "کہتےہیں آپ کو وہم ہے، اور وہم کا علاج حکیم لقمان کےپاس بھی نہیں ۔ ہنھہ!"

حکیم کے لفظ پر زبیدہ کورتن تلاؤ والے حکیم قدوس کا خیال آیا جو انوچا سنتے تھے اور ان کی بینائی بھی جاتی رہی تھی، پر زبیدہ کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہی انھوں نے جو بات کہی تھی اس نے زبیدہ کے سارے نسوانی ، ذہنی اور جسمانی امراض پر جیسے پھاہا سر رکھ دیا تھا۔

"بیٹی پیٹ اُم الامراض ہے۔ بس اس کا خیال رکھو تو جسم کا سارا کارخانہ ٹھیک چلتا رہے گا۔"

ان کے مطب میں اکثر و بیشتر مریضوں کو نسخہ بھی خود ہی لکھنا پڑتا تھا اور مطب کے پچھلے حصے میں جا کر دوا کی پڑیاں بھی خود ہی بنانی ہوتی تھیں۔

جوارش جالینوس ، ہڑبھیڑہ، گاؤزبان اور شربت بیضوری ، خمیرہ ابریشم جواہر والا کی ڈبیا نسخے میں شامل نہ ہونے کی صورت میں بھی زبیدہ اپنی دوا میں ضرور شامل کرتی تھی، کھانے کے بعد دونوں وقت کے میٹھے کے لیے۔ حکیم صاحب بچارے ایکا ایکی مرگئے۔ ورنہ زبیدہ کو کیا پڑی تھی کہ وہ ان سر پھرے ڈاکٹرصاحب کے پاس آتی جو اس کے سارے امراض کو پس پشت ڈال کر برسک واک کا مشورہ دے رہےہیں۔ برسک واک نہ ہوئی آب حیات ہوگئی کہ برسوں کےپیچیدہ امراض جن کو ایک عرصہ سے مرغن کھانے پکا پکا کر اور کھا کھا کر گھر کی چہاردیواری میں بیٹھ کر اس نے پالاتھا، ختم ہوجائیں گے۔ اور چلو واک بھی کرلو، مگر کہاں؟

"پڑوسیوں کے سامنے دھمادھم کودوں؟"

مشکل تو یہ تھی کہ وہ ایک بنیاد پرست معاشرے سے تعلق رکھتی تھی اور اس کے نزدیک مذہب اور بنیاد پرستی ایک ہی چیز کے دو نام تھے۔

وہ اپنے سنیاسی باوا بھی تو ہیں۔ گھٹاٹوپ اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن ! فیڈرل بی ایریا، ناظم آباد اور نارتھ ناظم آباد کی دیواروں پر لکھا ہوا سنیاسی باوا کا نام اور ان کی کرامات ایک ایک کرکے اس کی نظروں کے سامنے گھومنےلگیں۔

"آپ مایوس نہ ہوں۔ مردانہ کمزوریوں کا شرطیہ علاج۔ شربت اکسیر۔ عورتوں کےلیے پردے کا خاص انتظام ۔ ہمارا شربت جو بن بہار آب کی لٹی ہوئی بہاریں واپس لاسکتا ہے۔"

ان ہنگاموں کے دنوں میں فیڈرل بی ایریا جانا اور سنیاسی باوا کو ڈھونڈنا جان جوکھوں کا کام ہے۔ وہ ہونقوں کی طرح منھ کھولے شہر کوٹٹولنے لگی۔ شاید کوئی باغ نظر آ جائے ، کوئی پارک ، کوئی چھوٹا موٹا میدان ہی سہی ، جہاں وہ سب کی نظروں سے چھپ کر تیز تیز چل سکے۔

بوڑھا صحافی اردیشر کہہ رہا ہے:

"یہ پورا شہر ایک پارک کے مافق تھا، صاف ستھرا۔ ان سالالوگ نے پورے شہر کا بیڑا غرق کردیا۔ ام بولا بابا ڈرم میں جا کر تھوکو۔ یُوزمی والے ڈبے کو استعمال تو کرو۔ پر وہ تو ایدھرروڈ پر تھوک مارتا ہے۔ باپ رے باپ، اتنا بڑا بڑا خون کے مافق تھوک۔ وہ اپنا نسر وانجی جب میئر لگاتھا، روڈ شیشے کے مافق چمکتا تھا۔ ہر طرف پارک ہی پارک تھا۔ اب پتا ہی نہیں چلتا روڈ کدھر ہے، پارکدھر ہے۔ سالا لوگ پورا شہر بیچ کر کھاگئے۔ ام بولتا ہے بچوں کے لیے پارک بناؤ، وہ بولتا ہے ام پلازا بنائے گا۔ لونڈیاکا کاروبار کرتا ہے پلازا بنابنا کر۔

کلفٹن برج سے اتر کر تین تلواروں والے چوراہے سے گزر کر آغا سپر مارکیٹ والے چوراہے پر جب وہ سیدھے ہاتھ کی طرف خیابان رومی پر مڑی تو بوٹنگ بیسن اور بلاول ہاؤس کی طرف جاتے ہوے بائیں ہاتھ کی طرف اس کو بالاخر ایک پارک نظر آہی گیا: جاگنگ پارک۔

اس نے گاڑی کو اسی سڑک پر موڑا۔ دور سے بھٹے والے کے ٹھیلے پر جلتی آگ کی لپٹیں لال لال زبانیں نکال کر اس کو اپنی طرف بلا رہی تھیں۔ بھنے ہوے بھٹوں کی خوشبو دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ ٹھیلے کے گرد بچے اور بڑے گھیرا اڈالے کھڑے تھے، اپنی باری کے انتظار میں۔ پارک کے باہر حد نظر تک چھوٹی بڑی گاڑیوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں جو میں پجارو اور لینڈ کروزر بھی شامل تھیں، سیاسی لیڈران کی،

جن کے دونوں طرف کلاشنکوف لیے ہوے باڈی گارڈ یا کمانڈوز، اور جن کے متعلق اب مشہور ہےکہ انھوں نے اپنے بیت الخلاؤں میں بھی دو کموڈ رکھوائےہیں، ایک اپنے لیے اور ایک اپنے کمانڈو کےلیے۔ دو کمانڈو باہر پجارو اور لینڈ کروزر پر بیٹھے ہوے ہیں۔ مکمل حفاظت ، ایک مرگ ناگہانی سے بالکل محفوظ!

شاید یہ لطیفہ ہو، مگر جاگنگ پارک کےباہر جو حفاظتی انتظامات نظر آئے ان کو دیکھ کر شبے کی گنجائش نہیں رہی۔ زبیدہ نے گاڑی ایک طرف کھڑی کر کے جاگنگ پارک کا ایک سرسری سا جائزہ لیا۔

مئی کا اوائل ۔ فضا میں تازہ گھاس اور پھولوں کی مہک تھی۔ زمین کے اندر سے نئی کونپلیں سر اٹھا رہی تھیں۔ درختوں کے پتے جھڑنے کے بعد ہلکے ہرے پتے نکلنے شروع ہوگئے تھے جو بتدریج سبز کاہی رنگ میں تبدیل ہوتے جا رہے تھے۔ ہر طرف ہلکا ہرا، گھرا ہرا اور سبز کاہی رنگ پھیلا ہوا تھا۔ وسیع اور کشادہ لان ہری بھری گھاس سے بھرے ہوے تھے۔ ڈھاکا ٹیرس ۔ میدان میں لگے ہوے بچلےکےکھمبوں پر برقی روشنی کے تیز بلب روشن تھے۔ ہیڈمالی کے گھر سے جو پارک کے ایک کونےمیں ٹین کی چھت ڈال کر بنایا گیاتھا، شاید کوری مٹی کی ہینڈ یا میں دودھ ابل رہا تھا اور اس کی مہک بیرونی ممالک سے لائے ہوے کلون، پرفیومز اور سینٹ کی ہوش ربا خوشبوؤں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی فضا کو مسحور کرہی تھی۔

چہل قدمی کرنے والے کچے اور پکے راستے (ٹریک) عورتوں مردوں اور بچوں سے بھرے ہوے تھے۔ ایک خلقت تھی جو دوڑ میں مصروف تھی۔ ہر طبقے، ہر عمر اور ہر قد کاٹھی کی مخلوق ، مریض ، صحت مند ، جوان، بوڑھے، بچے، مرد، عورت، خوبرو، بدشکل، مفلوج، معذور ویل چیئرز پر، سائیکل سوار، تاجر، ضعت کار، وزیر ، مشیر ، سیاست داں، صحافی اور دانشور۔ جنریشن گیپ کا لیبل لگائے نوجوان نسل ۔ ۔ بے نتھے بجار۔۔ اور ان کو کن انکھیوں سے دیکھنے والی بزرگ نسل ، جوان کو دیکھ بھی رہے تھے اور محفوظ بھی ہو رہے تھے۔ محفوظ ہونا ان کی مجبوری تھی۔

زبیدہ نے جاگنگ پارک کا ایک چکر لگایا اور باہر نکل آئی۔ اب اس نے اپنی گاڑی کو ڈیلاوالی سڑک پر موڑ ا جہاں چورا ہے کےبائیں طرف باسکن آئس کریم ، باٹا اور سروس شوز کی دکانیں برابر برابر تھیں اور اس وقت بچوں اور بروں سے کھچا کھچ بری ہوئی تھیں۔ اسکول کی چھٹیاں ختم ہو چکی تھیں اور بچے "پہلے باٹا پھر اسکول "والے جنگل پر عمل پیرا تھے اور اور بیک وقت آئس کریم، جوتے اور جرابیں خرید رہےتھے۔ زبیدہ ا س بھیڑ کو چیرتی ہوئی باٹا کی دکان میں گھس گئی اور مختلف جوتوں کو اپنے پیروں میں ڈال ڈال کر دیکھنے لگی۔ کوئی جھنگلی دبا رہا تھا تو کوئی تلوا۔ کسی کا سول پتلا تھا تو کسیکی ٹوگھوڑے کی شکل سے ملتی تھی۔ کوئی نیچے پر سے تنگ تھا تو کوئی ایڑی میں کُھب رہا تھا۔ "جوتا خریدنا بھی اچھی خاصی مشقت ہے، "اور جوتا بھی وہ جس سے مستقل چالیس منٹ تیز تیز چلنا تھا، اس لیے زبیدہ کچھ زیادہ ہی محتاط ہو کر جوتے پہن اور اتار رہی تھی۔ باٹا نکل کروہ سروس میں جا گھسی۔ وہاں بھی وہی حال ، وہی جوتے، جرابیں، وہی آئس کریم کے گلاس اور وہی بچوں کی بھیڑ۔ اس نے دوچار چھوٹے بڑے سروں کو پھلانگتے ہوے شیلف پر سے ایک نیلے رنگ کا کینوس کا جوتا اٹھایا جس کا ایک پیر ایک بچے کے آئس کریم کے پیالے میں جا گرا۔ بچہ ایڈیٹ محکمہ کر غرایا۔ آج کا بچہ ، کل کا سیاست داں۔ زبیدہ نے جوتا پیر میں ڈالا۔ آئس کریم سے لت پت جوتا اس کے پیر میں پورا فٹ بیٹھا تھا۔ کاؤنٹر پر پیسوں کی ادائیگی کے بعد اس نے اپنے پرس کے اندر جائگا۔ الٹراساؤنڈ، بلڈ رپورٹ، ڈاکٹر کی فیس اور واکنگ شوز ۔۔ پورے سترہ سو روپے خرچ کرنے کے بعد اس نے ایک ٹھنڈا سانس لیا اور گاڑی میں بیٹھے ہی بیٹھے ڈائیٹنگ اور برسک واک کا ارادہ کر ڈالا، جو بقول ڈاکٹر آند ھرے اس کا علاج تھا اور اب تو مجبوری بھی تھی۔ گھر کے بجٹ میں سے سترہ سو روپے کا خاره مین سی طور تو پورا کرنا تھا۔

دوسرے دن غروب آفتاب کے بعد جوتے موزے پہن کر اس نے جاگنگ پارک کا رخ کیا۔

پارسی صحافی اردیشر اور اس کی سیکرٹری امینہ اپنے مداحوں کے جلو میں تیز تیز چل رہے تھے۔ اردیشر ، کراچی کا بوڑھا صنعت کار صحافی، جو ماہر ماحولیات بنا ہوا تھا اور شہر کو خوب صورت بنانے کی کوشش میں حکومت اور بلند عمارات بنانے والے ٹھیکے داروں سے بر سر پیکار تھا، کہہ رہا تھا:

"کراچی میں تو پہلے ہی جنگلات نہیں تھے۔ اب ان لابی لوگوں نے شمالی علاقوں کے بھی جنگل ختم کر دیے۔ یہ لوگ جنگلوں کو فصل کی طرح استعمال نہیں کرتے بلکہ ۔ کانوں کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ سال لوگوں نے کراچی کو کھنڈر بنا دیا ہے۔ زمینیں بیچ کر کھا گئے۔ بچوں کے کھیلنے کے میدانوں اور پارکوں پر اونچی اونچی اور گندی بلڈنگیں بنا دیں۔ اب اس پارک پر بھی دانت لگائے بیٹھے ہیں گدھ کی اولاد۔ ایسی تیسی کر ڈالی پورے شہر کی۔ سن پینتالیس کا یہ شہر بیرونی ملکوں کے سیاحوں کا ایک خوب صورت خواب تھا۔ آج ان گدھوں کی خوراک بن چکا ہے۔

زبیدہ کے آگے ایک تیز طرار لڑکی ٹائٹ جینز اور کولھوں سے اوپر والا بلاؤز پہنے اپنے بھاری بھر کم کولھوں کا دائیں بائیں ہلاتی ہوئی تیز تیز چل رہی تھی۔ اس کی حال میں ایسی کشش تھی کہ لمحہ بھر کو بید و اس کی شکل دیکھنے کے لیے بے چین ہو گئی۔ ، پہچاننے میں اس کو ذرا دیر نہیں لگی۔ وہ ماموں مبارک علی کی پندرہ سالہ پوتی حرا تھی ۔ ماموں مبارک علی نے زندگی عورتوں کی بے باکی اور بے پردگی پر دھواں دھار تقریریں کی تھیں، اور گزشتہ ربع صدی میں خاندان بھر کی نوجوان لڑکیوں کے لیے ہوا ہے رہے تھے۔ لڑکیوں کے نقاب سے عاری کھلے منحہ دیکھ کر ان پر تھوک دیا کرتے تھے۔ ان ماموں مبارک علی کی پوتی سیلی جینز اور شعرخ بلوز میں اپنے نسوانی ابھاروں کا مظاہرہ کرتی ہوئی مرد تو مرد، عورتوں کو بھی دعوت نظارہ و دے رہی تھی۔

دور میدان میں کرکٹ کی دنیا کے مشہور کھلاڑی کی نئی سانولی، ٹیلنٹڈ اور دولت مند بیوی لکڑی کی ایک کرم خوردہ بنچ پر کو بھی ہوئی سی۔ بیٹھی تھی۔ اس کو اس ہرے بھرے لان میں بھی اس کرم خوردہ بینچ کی تیک سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ وہ غالباً ان آرائشی کرسیوں کے بارے میں سوچ رہی تھی جن کو وہ خود ڈزائن کرتی تھی اور بیرونی ممالک میں بھیجتی تھی۔ اس کا بھاری بھر کم شوہر ، جو کبھی اپنے چوکوں چچگوں ، مردانہ وجاہت اور کسرتی بدن کے لیے ہزاروں دلوں کی دھڑکن تھا، جاگنگ پارک کے کچے راستے پر کسی بھاری بھر کم ہاتھیکی طرح ہانپ ہانپ کر دوڑ رہا تھا۔

زبیدہ نے لان میں بیٹھی ہوئی اس کی نئی نویلی بیوی کو ایک بار پھر دیکھا، اور تب اس کو ایک اَور عورت کا خیال آیا جو عورت بھی تھی ، بیوی بھی تھی اور دو معصوم بچیوں کی ماں بھی تھی۔ وہ بھی شاید کسی کِرم خوردہ بنچ پر بیٹھی اب حالات سے سمجھوتا کر چکی ہوگی۔ اس نے اپنی رفتار تیز کردی۔

لان کے ایک گوشے میں پورا دستر خوان بچھا تھا۔ کوئی میمن خاندان بھیل پوری اور چھولے کی چاٹ، گول گپوں کا ٹوکرا اور پان مسالے کے ڈبے سجائے پکنک منانے میں مشغول تھا۔ بچے، جو کھیل کھیل میں زیادہ کھاگئے تھے، سبز لان پر پھٹے ہوے دودھ جیسی اُلٹیاں کرنے میں مصروف تھے۔ بھیل پوری ، دہی پکوڑے اور پان مسالے کا ملا جلا ملغوبہ پورے لان میں بکھر ا ہوا تھا۔ مالی اس پورے خوش باش خاندان کو گھور رہا تھا جو اس کی نظروں سے بے خبر ملکی مسائل پر تبادلہ خیال کر رہے تھے۔

خوشبو کا تیز بھپکا زبیدہ کی ناک میں گھستا چلا گیا۔ دونوں عورتیں لمبے لمبے چغے پہنے ہوے تھیں۔ گلے میں پڑی ہوئی سونے کی زنجیریں چلتے میں گر جا کی گھنٹیوں کی طرح بجتی تھیں۔ یسوع مسیح کی یہ بھیڑیں سیاہ لباس میں سر سے پیر تک ڈھکی ہوئی تھیں۔ جسمانی اعضا کی نمائش کی اس دوڑ میں بی بی مریم اور ماریا قبطیہ کہیں سے بھٹک کر آگئی تھیں۔

دور ساسی والوں کے بنائے ہوے جدید وضع کے مکان میں آرام کرسی پر دراز اموں مبارک علی اپنی پندرہ سالہ پوتی حِرا کا انتظار کر رہے تھے جو جاگنگ پارک میں تیز چلتے ہوے بار بار رک جاتی تھی، اپنے روغنیات اور چربی چڑھے جسم کا جائزہ لینے کےلیے۔ ایک چکر میں جسم کے کتنے حرارے پگھلتے ہیں، اس کا اندازہ اسے تھا۔ وہ ایک مدت سے جسم کے ان حراروں کو پگھلانے کےلیے جاگنگ پارک میں تیز تیز چل رہی تھی۔ ادھر ماموں مبارک علی اس سےاور اس جیسی ساری بھاری کولھوں اور کھلے چہروں والی لڑکیوں سے خوش تھے جو اپنے نسوانی اعضا کو متنا سب رکھنے کےلیے صبح شام جاگنگ پارک جا کر برسک واک کرتی تھیں۔

ہفتہ بھر کی برسک واک سے ہی زبیدہ کو بہت فائدہ ہوا تھا۔ نہ صرف یہ کہ جسم چڑھی ہوئی چربی کم ہونا شروع ہوگئی تھی، بلکہ ذہن پر بھی جو ٹھوس برف کی تہہ جمی ہوئی تھی وہ بھی آہستہ آہستہ پگھلتی جار ہی تھی۔ وہ جو اب تک کنویں کا مینڈک بنی اپنے ہی اندر ڈبکیاں کھاتی رہی تھی، ایک ہی چھلانگ میں باہر نکلے تو دنیا ہی اور تھی۔ بقول شخصے، ایسا معلوم ہوتا تھا" جیسے پاکستانی خواتین آج کل بہت دبا و میں تھیں، اس لیے کہ ان کے وہ اعضا جن کو وہ نمائش کےلیے استعمال کرتی تھین، یعنی چھاتیاں، کولھے اور پنڈلیاں، وہ روغنیات یا کسی اور وجہ سے فریہی کی طرف مائل تھے اور ان کو قابو میں رکھنے کےلیے خواتین کو پریشان کن حد تک ڈائٹنگ اور واک کرنی پڑ رہی تھی۔"

جاگنگ پارک کےپکے راستے پر چمکی ہوئی جوانیوں سے نکلتی ہوئی خواتین جلد از جلد ورن کم کرنے کی کوشش میں بے نکان دوڑ رہی تھی۔ ان کی کوشش مردوں کو اپنی طرف مائل کرنے کی سعی لاحاصل تھی۔ پھیلے ہوے دائیں بائیں ہلتےہوے کولھے، ڈھلکی ہوئی بھاری چھاتیوں پر جرزی کے مندھے ہوے بلاؤز ، پنڈلیوں پر ڈھلتی ہوئی عمر کے نشان ان کی تنگ مُہر یوں والی جینز میں سے صاف نظر آرہے تھے۔ وہ سب اپنا وزن جلد سے جلد کم کرنے کی لاحاصل کوشش میں لگی ہوئی تھیں۔ مرد، جو بیک وقت دانشور، سیاست داں، صحافی اور کھلاڑی سب ہی تھے، اول و آخر مرد تھے۔ ان میں بیشتر کو خود نمائی اور نمائش کا جو موقع ملا تھا اُس کو وہ گنوانا نہیں چاہتے تھے۔ وہ خود نمائی کو مبالغہ آمیز حد تک لےگئے تھے۔ اپنی باری بھر کم رانوں کی نمائش کےلیے کسی ہوئی نیکریں پہن رکھی تھیں۔ بازو کی مچھلیوں کو گلائی میں مروڈ تے ہوے وہ نوجوان لڑکیوں کے سامنے سے ایسے گزرتے تھے جیسے جہاں سے گزر رہے ہوں۔ کھلے گریبان اور بنیانوں میں سے نظر آتے سیاہ بالوں کے کچھوں کی نمائش ، تنگ نیکروں کے اندر سے دکھائی دیتا ہوا پیڑووں کا اُبھار ، اور پھر نوجوان عورتوں کو آتا ہوا دیکھ کر جنسی کج روی سے مغلوب ہوکر اپنی اعضا کی نمائشی مالش میں مصروف ہوجانا، یہ سب اُن کی برسک واک میں شامل تھا۔

ان ہی میں سے کوئی مسٹر کراچی بن کر کھڑا ہوجاتا اور اپنے آگے اور پیچھے کے دھڑکو عجیب و غریب انداز میں بلاتا ہوا گزرجاتا۔ زبیدہ حیران آنکھوں سے، اور تیز تیز چلتے ہوے یہ سب کچھ دیکھتی ۔ دیکھنا اس کی مجبوری تھی۔ اس کو چالیس منٹ کی برسک واک جو کرنا تھی۔

بہت سی نوجوان لڑکیاں ایک ساتھ اور ایک ہی سمت میں چل رہی تھیں۔ دروازے میں سے ایک آدمی، عمران خان سے ملتا جلتا، پارک میں داخل ہوا ۔ چلتی ہوئی لڑکیوں کے قدم ایک ساتھ رک گئے۔ لڑکیوں کو اپنی طرف آتا دیکھ کر بازو کو مچھلیوں کو دکھانے والے نوجوان نے پیڑو کو سہلانا شروع کردیا، اپنے پیٹ کو دبا یا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر مینڈک کی طرح اُچھلنےلگا۔ لڑکیوں نےاس کی حرکتوں کو نظر انداز کرتے ہوے اپنی واک جاری رکھی۔ وہ جس قدر تیزی سے چل رہی تھیں اسی قدر تیزی سے بول رہی تھیں۔

"کل شا م کی پارٹی میں دہی پھلکیاں۔۔ واٹ اے ونڈرفل آئٹم ! بٹ پیسٹریز ور ناٹ گڈ۔"

"کفِ کُول کا بس پیزا اچھا ہوتا ہے، "حرا نے کہا اور اپنے بھاری کولھوں پر ہاتھ رکھ کر اُن حراروں کا اندازہ لگایا جو وائٹل سائنز کو دیکھ اور سُن کر اور پیز ا کھا کر ایک دم بڑھ گئے تھے۔ اس نے چلتے ہوے اپنے بھاری جسم کو زور زور سے جھٹکے دیے۔ ایسا کرتے ہوے اس کے بلاؤز کے سامنے کے بٹن کھل گئے۔ اس کی گداز چھاتیوں پر لیس کا محرم جس کے درمیاں میں ایک خوب صورت بو بھی لگی ہوئی تھی، لڑکیوں کو حیران کر گیا۔

کہاں سے خریدا؟" ایک ساتھ بہت سی آوازیں بلند ہوئیں، اور حِرا چلتے چلتے اپنے بٹن بند کرنے لگی۔

سامنے والے دروازے کے سامنے سر سبز لان پر ایک جماعت ابھی ابھی آکر بیٹھی تھی جس میں کچھ ناکام سیاست داں تھے جو کرتے پجامے میں ملبوس تھے۔ چند اونچی شلواریں پہنے اور کند ھوں پر رومال ڈالے تبلیغی جماعت کے لوگ ، جن میں نوجوان بھی تھے اور ادھیڑ عمر کے امیر جماعت بھی۔ سندھی، میمن ، پنجابی، پٹھان۔۔ یہ ایک ملی جلی جمعاعت تھی جن کے اپنے اپنے موضوع تھے۔ ایک سیاست داں جو حلیے اور چہرے مہرے سے ناکام لگتے تھے، لیاقت علی خاں کا موازنہ موجودہ سیاست دانوں سے کر رہے تھے۔

"سیاست داں بس ایک ہی تھے، وہ اپنے لیاقت علی خاں ۔ بھری اسمبلی میں نہرو کو دھوتی پر شاد کہہ دیا۔ ہے نا ہمت کی بات؟" ایک زور کا قہقہ پڑا اور دوسرے صاحب بولے:

"وہ عمران خان جو پریشر گروپ بنا رہا ہے وہ کیا چیز ہے؟

"چیز کا تو ہمیں بھی پتا نہیں۔ ایدھی نے بھانڈا تو پھوڑدیا۔ زور ذرا کم ہوگیا ہے اس پر پریشر ککر کا۔"

"آپ ستار بھائی کو کچھ نہیں بولینگا۔ وہ بچارا تو آپ لوگوں کی لاشیں اٹھا اٹھا کر دفنا رہا۔ نہ کرے تو بنیں گی ناگدھوں کی خوراک!"

"گدھ اب مُردار نہیں کھاتے،"دور پیڑ کے نیچے کھڑا بوڑھا صحافی اردیشر بولا۔

"وہ تو اچھا اچھا ہپ کرنے میں لگے ہیں،"لیاقت علی کے حمایتی بولے۔

"تضیع اوقات سے فائدہ ؟ آپ لوگ خواہ مخواہ دوسروں میں کیڑے نکال رہے ہیں۔ حضرات ، اپنا محاسبہ کیجیے پہلے، "ایک صاحب بولے جو شاید تبلیغی جماعت کے امیر تھے۔ انھوں نے لان میں چلتی ہوئی لڑکیوں کے جسمانی نشیب و فراز سے بہ مشکل تمام اپنی نظروں کو بچاتے ہوے خطیبانہ انداز میں کہا:

"جب کسی قوم یا بستی پر عذاب آجائے تو صرف وہ لوگ بچالیے جاتے ہیں جو آخری وقت تک برائی سے روکنے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔"

"اس شہر میں تو کوئی ایسا فرد نظر نہیں آتا، "دوسرے صاحب بولے۔

"اس قدر مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ اسلام میں مایوسی یوں بھی کفر ہے، "امیر جماعت بولے۔

"کئی بار ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان کےلیے آخری حد مقرر کردی جاتی ہے۔ اگر وہ اسے بھی پر کر جائیں تو ان پر فوراً عذاب وارد ہوجاتا ہے۔"

اب کون سی حد باقی رہ گئی؟ہم ساری حدیں تو پھلانگ چکے ہیں۔" ایک نوجوان ، جو تبلیغی جماعت ہی سے تعلق رکھتا تھا مگر اس نے شلوار کی جگہ جینز پہن رکھی تھی اور داڑھی بھی فرانسیسی طرز کی تھی، جوش اور جذبے میں سے آگے تھا۔

"صبر، صاحب زادے، صبر ۔صبر کی بھی اسلام میں ؎بڑی فضیلت ہے۔ سورہ النسا میں اللہ نے فرمایا ہے: اللہ تمھیں عذاب دےکر کیا کرے گا، اگر تم صبر کرو اور اس کا شکر کرو، اس پر ایمان لاؤ ، اور اللہ قدر شناس ہے۔ تمھیں خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اسلام دینِ فطرت ہے۔ اس میں اچھے اور برے سب کےلیے حدود مقرر ہیں۔ سورہ ھود میں صاف صاف وضاحت کی گئی ہے: جب کسی قوم پر عذاب آیا، پیغمبر اور اس کے ساتھ ایمان لانے والے لوگوں کو عذاب سے بچا لیا گیا۔ حضرت نوح اور ان کے ساتھی غرق ہونے سے بچ گئے، مگر چونکہ ان کا بیٹا کافر تھا، وہ غرق ہو گیا۔ حضرت لوط اور ان کا کنبہ بچا لیا گیا، مگر ان کی بیوی نہ بچ سکی کیوں کہ وہ بستی کے لوگوں کو جو بُرا کام کرتے تھے، دل سے برا نہیں سمجھتی تھی۔"

یہ سن کر وہ نوجوان کچھ اَور زیادہ بے چین ہوگیا۔ وہ اپنے راشی باپ کی لینڈ کروزر میں بیٹھ کر آیا تھا جو باہر کھڑی تھی۔ اس میں دوگارڈ کلاشنکوف سنبھالے بیٹحے تھے اس کے حفاظت کے لیے، کیوں کہ اس کو جماعت کے ساتھ رائے ونڈ جا نا تھا۔

"میرا حشر بھی حضرت لوط کی بیوی جیسا ہوگا۔ میں دل سے۔۔۔" وہ آدھا جملہ کہہ کر رک گیا اور اس گروہ میں سے اٹھ کر دور لان میں ایک سایہ دار درخت کے نیچے آنکھیں بند کرکے بیٹھ گیا۔ شاید وہ نروان حاصل کرنےکی کوشش کر رہا تھا۔

ایک ماہ بعد زبیدہ پھر ڈاکٹر آند ھرے کےمطب میں اسی ٹٰن کے اسٹول پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر آندھرے کے سامنے اس کی نئی رپورٹیں کھلی ہوئی رکھی تھیں۔ وہ بار بار اپنے چشمے کو صاف کرتے، اپنی گول گول آنگھوں کو شیشے کے اندر ہی اندر گھما تے ، پھر زبیدہ کو دیکھتے ۔ ایک ماہ پہلے والی زبیدہ اور آج کی زبیدہ میں نمایا فرق تھا۔ نہ جھم پر چربی چڑھی ہوئی تھی، نہ چہرے پر گھبراہٹ ، نہ ذہن پر بوجھ اور نہ تھکاوٹ کا احساس ۔ وہ ہلکا پھلکا جسم اور ہر فکر سے آزاد ذہن لیے ڈاکٹر کے سامنے اسی ٹین کے بے آرام اسٹول پر بڑے آرام سے بیٹھی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر آندھرے خوش بھی تھے اور فکر مند بھی۔ وہ بار بار اپنے چشمے کے شیشے صاف کرتے اور نظریں کبھی زبیدہ پر اور کبھی اس کی بلڈ رپورٹ پر گاڑ دیتے ۔ وزن کم ہونے کے باوجود اس کی بلڈ رپورٹ صحیح تصویر پیش نہیں کر رہی تھی۔ لپڈس ، کلسٹرول ، یورک ایسڈ، ہر چیز پہلے کے مقابلے میں بہت بڑھی ہوئی تھی۔

"ایسا کیوں ہے؟" ڈاکٹر نے خود سے کہا، اور پھر ذرا اونچی آواز میں بولے:

"آپ کے خون میں لپڈس اورکلسٹرول بہت بڑھ گیا ہے۔ یورک ایسڈ بھی پہلے سے زیادہ ہے۔ کیا اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟"

"آپ کا مطلب فاصد مادوں سے ہے؟" زبیدہ نے حکیم فدوس کی زبان استعمال کی۔

"میں کیا کہہ سکتی ہوں۔"

"اچھا ، تو پھر ایسا کیجیے کہ آپ اپنی واک کا ٹائم کچھ اور بڑھا دیجئے۔"

"بہت اچھا" کہہ کر زبیدہ اسٹول سے کھڑی ہوئی۔ اس نے میز پر پڑی اپنی رپورٹوں کو اٹھایا، مروڑی دے کر اپنے پرس میں ٹھونسا اور ڈاکٹر آندھوے کا شکریہ ادا کرتی ہوئی کمرے سے نکل کر باہر آ گئی۔

گاڑی میں بیٹھنے کے بعد اس نے باور کر لیا : جا گنگ پارک میں ایک ماہ تک چالیس منٹ بر سک واک کرتے ہوے ذہن، آنکھوں اور کانوں کے راستے جو فاسد مادے معدے میں داخل ہوکر خون میں شامل ہوے ہیں، یہ سب انھیں کا فتور ہے۔

اس نے اپنی گاڑی کو گھر کی سمت موڑا ۔ گھر میں داخل ہونے کے بعد وہ اپنے کمرے میں بچھے ہوے آرام دہ صوفے میں دھنس کر بیٹھ گئی۔

اب وہ جاگنگ پارک میں برسک واک کرنے کا پروگرام قطعی طور پر ترک کر چکی تھی۔

٭٭

محاذ نے فسادات کی تحقیقات کرنے کے مقصد سے ایک ٹیم بھی تشکیل دی۔ میں نے اس میں شامل ہونے پر کچھ دیر ھور بھی کیا، مگر پھر فیصلہ کیا کہ تحقیقات کرنے سے سے سواے وقت ضائع کرنے کے کوئی مقصد حاصل نہیں ہو گا کیوں کہ سیاست داں، جو تشدد کو اکسانے کی صلاحیت رکھتے ہیں، حسناس شہریوں کے ایک مختصر سے گروپ کی بات پر کان نہیں دھریں گے۔

میرا خیال غلط تھا۔ اس تحقیقاتی ٹیم نے آخر کار ایک چھوٹی سی کتاب تیار کی ۔۔ایک مختصر پمفلٹ جس کا عنوان تھا: "مجرم کون ہیں ؟ "۔۔ جسے اب کلاسیک کا درجہ حاصل ہو چکا ہے۔ یہ دستاویزان سیاست دانوں کے خلاف ایک سخت فردجرم ہے جنھوں نے فسادات کو ہوا دی تھی، اور پولیس کے خلاف بھی جس نے فسادیوں کی کارروائی میں کوئی مداخلت نہیں کی تھی۔

برسوں کے عرصے میں ہندوستانی حکومت نے ۱۹۸۴ کے فسادات کے بعض متاثرین کو معاوضہ ادا کیا ہے اور کچھ بے گھروں کو آباد کیا ہے ۔ مگر سر کاری اقدام میں ایک خلا آج تک موجود ہے : فسادات کو بھڑ کانے والے کسی ایک بھی شخص کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ لیکن حکومت پر دباو مسلسل بر قرار رہا ہے، اور اس دباو میں اضافہ ہوا ہے : ہر سال اس مختصر دستاویز کی ٹھو بھی ہوئی کیلیں کچھ اور گھرائی تک اتر جاتی ہیں۔

یہ پمفلٹ اور اس کے بعد شائع ہونے والی دوسری دستاویزات ان لوگوں کے لیے موجود واحد ممکن انسانی راستے کی شہادت دیتی ہیں جو کئی نسلی گروہوں ، کئی مذہبوں کے ماننے والوں پر مشتمل معاشرے میں رہتے ہیں، جیسے معاشرے اس برصغیر میں موجود ہیں۔ مجرم کون ہیں ؟ جیسی انسانی حقوق کی دستاویزی شهری (civil) اداروں کو وسیع بنیادوں پر قائم کرنے کے عمل کے لیے لازمی ہیں : یہی وہ ہتھیار ہیں جن کے ذریعے سے معاشرہ ایک ایسی ریاست کے خلاف اپنے عزم کا اظہار کرتا ہے جو مجرمانہ طور پر سے کا ہو ہو گئی ہو، جیسے ہندوستانی ریاست نومبر ۱۹۸۴ کے دہلی شہر میں ہو گئی تھی ۔

یہ بات دل کو تقویت دینے والی ہے کہ پنجاب میں آج ہوش مندی کو غلبہ حاصل ہے۔ لیکن دوسری جگہوں پر نہیں ۔ بمبئی میں بلدیاتی حکومت کے اہلکار کسی عوامی عمارت پر سبز روغن کرنے کی ممانعت کر رہے ہیں۔۔ کیوں کہ اس رنگ کا تعلق مسلمانوں کے مذہب سے جوڑا جاتا ہے۔ اور شہر کی نچلے طبقے کی آبادیوں ((slumsسے سیکڑوں مسلمانوں کو شہر بدر کر دیا گیا ہے۔۔ کم سے کم ایک ایسے واقعے کا جواز محض یہ تھا کہ وہ لوگ ایک بنگالی اخبار پڑھنے کا جُرم کر رہے تھے۔ یہ بات بہت اہم ہے کہ حکومتیں ایسے لوگوں کو سزاسے نہ بچنے دیں جو ہجوم کے تشدد کو اُکسا تے ہیں۔

بوسنیائی ادیب جواد قرار حسن (Dzevad Karahasan) نے، اپنے ایک شاندار مضمون میں، جس کا عنوان "ادب اور جنگ " ہے اور جو پچھلے برس شائع ہونے والے اُن کے مجموعے "سرائیوو: ایک شہر کی جلاوطنی" (Sarajevo, Exodus of a city) میں شامل ہے، جدید ادبی جمالیات پرستی (aestheticism) اور تشدد کے معاملے میں معاصر دنیا کی بے حسی کے دمیاں ایک حیران کن تعلق دریافت کیا ہے: "بلا ستشنا ہر شے کا ادراک کسی جمالیاتی مظہر کے طور پر کرنے ۔۔ اور خیر اور سچائی سے متعلق ہر سوال کو مکمل طور پر نظر انداز کر دینے ۔۔ کا فیصلہ ایک فنکارانہ ہے۔ یہ فیصلہ آرٹ کی دنیا میں پیدا ہوا تھا اور بڑھتے بڑھتے معاصر کی خصوصیت بن گیا ہے۔"

جب نومبر 1984 میں میں اپنی ڈیسک پر واپس گیا تو میں خود کو لکھنے سے متعلق کچھ ایسے فیصلوں سے دوچار پایا جن سے میرا سامنا اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ جو کچھ میں نے دیکھا اس کے بارے میں کس طرح لکھوں کہ یہ گھٹ کر محض ایک نظارے (spectacle) میں نہ بدل جائے؟ میرے تجربات کا میرے اگلے ناول پر اثر انداز ہونا لازمی تھا، مگر مجھے کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آتی تھی کہ ان واقعات کے بارے میں براہ راست اس طرح کیوں کر لکھوں کہ وہ تشدد کے ایک ہمہ گیر منظر کی تخلیق نو ۔۔ یا ، قراحسن کے لفظوں میں، "جمالیاتی مظہر"۔۔نہ بن جائیں۔ اُس وقت یہ خیال مجھے فحش اور بے مصرف معلوم ہوتا تھا؛ تشدد کا نشانہ بننے والوں کی شہادتوں کا مبنی بر حقیقت بیان اس سے کہیں زیادہ اہم تھا۔ لیکن یہ کام اُن لوگوں کے ہاتھوں پہلے ہی انجام پا رہا تھا جو، میں جانتا تھا، اس کی صلاحیت مجھ سے کہیں زیادہ رکھتے ہیں۔

چند مہینوں کے اندر اندر میں نے اپنا ناول لکھنا شروع کردیا، جس کا نام آخر کار The Shadow Lines رکھا۔۔ یہ کتاب مجھے وقت میں پیچھے کی طرف لے گئی فسادات کے بارے میں میری اولیں یادوں کی طرف ، جب میں نے اپنے بچپن میں ان کا مشاہدہ کیا تھا۔ یہ ایک ایسی کتاب بن گئی جو کسی ایک مخصوص واقعے کے بارے میں نہیں ، بلکہ ایسے واقعات کے مضوم اور ان واقعات سے گزرنے والے افراد کی زندگیوں پر ان کے اثرات کے بارے میں تھی۔

ان جن واقعات کا مشاہدہ میں نے 1984 کے نومبر میں کیا تھا ان کے بارے میں میں نے در حقیقت آج تک کچھ نہیں لکھا ۔ اس معاملے میں میں اکیلا نہیں ہوں: اُس مارچ میں حصہ لینے والے کسَی افراد ایسے ہیں جن کی کتابیں شائع ہوئیں لیکن، جہاں تک مجھے معلوم ہے، کسی ایک شخص نے بھی ، سرسری انداز میں ذکر آجانے کو چھوڑ کر، ان واقعات کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔

اس کی بڑی معقول وجوہ موجود ہیں، او ر اُس صورت حال کا سیاسی پہلو ان میں سب سے کم اہم ہرگز نہیں جس کی موجودگی کے باعث لکھنے والے کے لیے کچھ کہنے کی کنجائش بہت کم رہ جاتی ہے۔اُن فسادات کو تشدد کے ایک سلسلے نے جنم دیا تھا، جس میں ایک جانب پنجاب کے دہشت گرد، اور دوسری جانب ہندوستانی حکومت دونوں ملوث تھے۔ اس موضوع پر بے احتیاطی سے لکھنا ، یا اس طرح لکھنا کہ اس سے دہشت گردی یا جابرانہ اقدامات کی حمایت کا پہلو نکلتا ہو ، بڑی آسانی سے مسئلے کی پیچیدگی میں اضافہ کر سکتا تھا: اُن آتش گیر حالات میں لفظوں کی قیمت انسانی جانیں بھی ہوسکتی تھیں، اور یہ بات بالکل مناسب ہے کہ وہ لوگ جو لفظوں سے سروکار رکھتے ہیں اپنے قلم یا زبان سے نکلنے والے الفاظ پر پڑی احتیاط سے توجہ دیں اور یہ بات بھی بالکل مناسب ہے کہ وہ خود کو کچھ کہنے سے معذور پائیں۔

لیکن اس کی ایک سادہ تر وضاحت بھی موجود ہے۔ اس سےپہلے کہ میں کاغذ پر ایک لفظ لکھ سکتا، مجھے ایک الجھاوے کو اپنے ذہن میں سلجھنا تھا: ادیب اور شہری کے طور پر میری دو حیثیتیں آپس میں گڈمڈ تھیں۔ ادیب کی حیثیت سے میرے سامنے ایک واضع تھا : تشدد۔ اخباری رپورٹوں سے، یا جدید ترین فلم یا ناول سے، ہم خون ریز تفصیلات یا نہایت خوش اسلوبی سے اسٹیج کی ہوئی آتش زنی کی توقع کرنے لگے ہیں جو کسی باب کے اختتام پر ، یا کلائمکس کے مقام پر، پُراثرانداز میں واقع ہو۔ لیکن یہ سوال بہت بامعنی ہےکہ اس موضوع ۔۔ تشدد۔۔ کا اس قدرواضع ہونا کہیں اظہار کی بابت ہمارے جدید اصولوں کی بنا پر تو نہں ہے؛ ہمارے زمانے کی غالب جمالیات کی حدوں میں۔۔ جسے قراحسن نے "بے حسی کی جمالیات" کا نام دیا ہے۔۔ تشدد کو ہیبت ناک نظارے کے طور پر پیش کرنا بےحد آسان ہو گیا ہے اور تشدد کی مزاحمت کو اتنی ہی آسانی سے نراجذباتی ، یا اس سے بھی بری بات کہنی ہو تو قابل رحم یا لغور، رد عمل قرار دے دیا جاتا ہے۔

ادیب ہجوموں میں شامل نہیں ہوتے ۔۔ نائپال اور متعد د دوسرے ادیب ہمیںیہی سکھاتے ہیں۔ لیکن جب آئینی حاکمیت اپنی ذمے داری پوری نہ کر رہی ہو تب کیا کیا جائے ؟ تب آپ شامل ہو جاتے ہیں ، اور شامل ہونے کے عمل سے وابستہ تمام ذمے داریوں ، تمام فرائض اور تمام تر احساس جرم کو قبول کر لیتے ہیں۔ تشدد کی بابت میرا تجربہ نہایت غالب اور یادگار طور پر تشدد کی مزاحمت پر مبنی تھا۔ جب میں غنڈوں کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھورتی ان عورتوں کے بارے میں سوچتا ہوں تو یہ خیال مجھ میں ادیبوں کی سی سحر زدگی نہیں پیدا کرتا۔ مجھے جسمانی ضرر سے بچا لیے جانے پر اپنی ممنونیتیاد آتی ہے۔ جو کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ۔۔ صرف اس مارچ میں نہیں بلکہ بس میں بھی، بکری کے گھر میں بھی ، ضرورت کی چیزوں سے بھرے احاطے میں بھی۔۔ وہ تشدد کی ہولناکی نہیں بلکہ انسانیت کا اقرار تھا : ان میں سے ہر موقعے پر میں نے اس خطرے کا مشاہدہ کیا جو نہایت عام لوگ ایک دوسرے کی خاطر مول لینے کو تیار تھے۔

اب میں جب کبھی دنیا کے پر آشوب خطوں کا احوال پڑھتا ہوں، جس کی رو سے تشدد نہایت بنیادی اور ناگزیر حقیقت معلوم ہوتا ہے ، ایک ایسی تقدیر جس سے لوگوں کی کثیر آبادیوں نے سمجھوتا کرلیا ہے، تو میں خود کو یہ سوال کرتے ہوے پاتا ہوں : کیا بات محض اتنی ہی ہے ؟ یایہ بھی ممکن ہے کہ ان احوال کے مصنف کوئی ایسی ہیئت -- یا ایسا اسلوب یا ایسی آواز یا ایسا پلاٹ۔۔ پانے میں رہے ، ناکام ر ہوں جو بیک وقت تشدد، اور تشدد کی مہذب اور دانستہ مزاحمت، دونوں کا اظہار کر سکے ؟

سچیہ ہے کہ تشدد کا سب سے عام رد عمل ناگواری کا ہوتا ہے، اور یہ کہ دنیا میں ہر جگہ ، خاصی نمایاں تعداد میں لوگ، جس طرح ان سے بن پڑے، تشدد کی مزاحمت کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ کوششیں تشدد کے تذکروں میں شاذونادر ہی جگہ پاتی ہیں، اور اس پر تعجب نہیں ہونا چاہیے : یہ کوششیں بہت غیر ڈرامائی ہوتی ہیں۔ ان کوششوں میں حصہ لینے والوں کے لیے ان کے بارے میں لکھنا اکثر دشوار ہوتا ہے، اور اس دشواری کی وجوہ وہی ہیں جنھوں نے ۱۹۸۴ کے بارے میں میری اپنی تحریر کو اتنے عرصےتک ملتوی کیے رکھا۔

"ہمیں خود کو فریب نہیں دینا چاہیے، " قراحسن نے لکھا ہے۔ "دنیا پہلے تحریر میں رونما ہوتی ہے ۔۔ مقدس کتا بیں بتاتی ہیں کہ دنیا کو لفظوں میں تخلیق کیا گیا تھا۔۔ اور جو کچھ پیش آتا ہے وہ پہلے زبان - کام میں کی تین کی کیا اور جو میں نے ان کےاندر پیش آتا ہے۔"

جب ہم اس دنیا کا تصور کرتے ہیں جسے بے حسی کی جمالیات پیدا کر نے پر قادر ہے، تبھی ہم ان کہانیوں کو یادرکھنے کی بے پایاں اہمیت کو پہچان پاتے ہیں جنہیں ہم نے اب تک نہیں لکھا۔

٭٭

**اِیوان کلِیما**

ـــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــ

انگریزی سے ترجمہ : اجمل کمال

**آزادی اور کوڑا کرکٹ**

کسی مطلق العنان حکومت کے سلسلے میں کلچر کا ذکر کرنا ہی بظاہر قول محال (paradox) سا معلوم ہو گا۔ آدمی کو خیال ہو گا کہ دانشورانہ بنجر پن ، نظر یہ پرستی، سنسر شپ، تعلیمی نظام کے مرکزی کنٹرول ، اور کلیسا کی زندگی اور فنون پر عائد پابندیوں نے کلچر کے لیے جگہ ہی کہاں چھوڑی ہو گی۔ مگر حقیقت بہر حال یہ ہے کہ معاملہ ایسا سیدھا سادہ نہیں تھا۔ کتابیں شائع ہوتی تھیں ، ٹیلی وژن پروگرام نشر کیے جاتے تھے اور ، بد ترین حالات میں بھی، وہ سب کی سب کتابیں اور ٹی وی پروگرام کراہت انگیز نہیں ہوتے تھے۔ پراگ ٹیلی وژن کلاسیکی ڈراموں کی شان دار پیش کشیں، فطرت کے موضوع پر فلمیں ، بچوں کے لیے ہاتھ سے بنائی ہوئی تصویروں پر مبنی اینی میٹڈ (animated) فلمیں وغیرہ نشر کرتا تھا۔ نمائشیں ہوتی تھیں اور تھیٹر تماشائیوں سے بھرے رہا کرتے تھے۔ کتابوں کا بازار محدود تھا، صرف گنی چنی کتابیں دستیاب تھیں، اور یہی بات تھیئٹروں اور سنیما گھروں کے ذخیروں، بلکہ خود سرکاری سفری ایجنسیوں کی جانب سے کرائے جانے والے سفری دوروں کے بارے میں بھی درست ہے۔ دوسری جانب یہ بھی حقیقت ہے کہ کتابوں اور ثقافتی تقر یہوں کے ٹکٹ کم قیمت تھے کیوں کہ کلچر کی جو بات جائز سمجھی جاتی تھی اسے بھاری مالی امداد ملتی تھی۔ جو کچھ اخباروں میں لکھا جاتا یا ریڈیو یا ٹیلی وژن سے نشر ہوتا وہ بلاشبہ دانسته دروغ گوئی پر مبنی تھا، بلکہ دروغ گوئی نے ، بچوں کو دی جانے والی تعلیم سے لے کر انتخابات کے عمل تک، زندگی کے بہت سے پہلوؤں میں جگہ حاصل کر لی تھی۔

سنسر شپ کو وسیع ترین بنیادوں پر نافذ کیا جاتا تھا: یہ ایک طرف لوگوں کو ہر اس چیز سے لاعلم رکھتی تھی جو نظریاتی طور پر مشتبہ ہو، نئی ہو، یا توازن کو درہم برہم کرنے کا امکان رکھتی ہو، اور دوسریطرف انھیں بدترین قسم کے کوڑے کرکٹ سے بھی محفوظ رکھتی تھی۔ پورنوگرافی پاکج روی اور کشت و محفوظ یا کج اور خون سے بھری فلمیں، جن کا سیلاب آزاد ملکوں میں موجود تھا، یہاں سرحدوں سے وڈیو کیسٹوں کی شکل میں اسمگل ضرور کی جا سکتی تھیں مگر انھیں وسیع تر ذرائع ابلاغ تک رسائی نہیں ملتی تھی۔ فن کا کوئی ایسا مظاہرہ جس میں فیکار حاضرین کی آنکھوں کے سامنے ایک بھی ذبح کرے اور پھر اس کے خون اور انتڑیوں سے کوئی فن پارہ تخلیق کرے، تصور سے باہر کی بات تھی۔

نام نہاد سوشلسٹ دور کے کلچر کے بارے میں سوچتے ہوے ہمیںیہ بھییادرکھنا چاہیے کہ اکثر لوگ حقیقی قدر رکھنے والی چیزوں کی ، تبدیلی کی،یا بلکہ نئے پن کی بھی شدید خواہش نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ حقیقتیہ ہے کہ جدید زندگی میں تبدیلی کیتیز رفتار کے باعث قدامت پسندی کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور اس خیال کو سہارا ملتا ہے کہ آرٹ کو بر کم اور مشتعل کرنے کے بجاے تفریح بہم پہنچانی چاہیے۔ اس نقطہ نظر ہے، آمرانہ نظام کی ثقافتی پالیسیاں، کم از کم ایک حد تک، اوسط فرد کے ذوق اور رایوں سے مطابقت رکھتی تھیں ، اور اگر کوئی کھی تھی تو محض یہ کہ وہ اس اوسط در ہے کے ذوق کی پوری طرح تسکین نہیں کر پائی تھیں، ضرورت سے زیادہ نصیحت آمیز تھیں ، اور اس بنیادی شرط کو ترک نہیں کرتی تھیں کہ آرٹ کو سب سے پہلے تعلیم کا ذریعہ ہونا چاہیے،یعنی سیاسی نظام کی خدمت کرنی چاہیے۔

آمرانہ نظام نے اپنا مخصوص طرززند گی ، اقدار کا اپنا حفظ مراتب پیدا کیا تھا، جس سے میری مرادان اقدار سے نہیں جن کا دعوی کیا جاتا تھا بلکہ اس نظام کی حقیقی اقدار سے ہے۔ پہلی نظر میں آمریت کےتحت زند کی بہت سی باتوں میں مغربی معالہ وں سے مشابہ معلوم ہوتی تھی : اس کا بھی مقصد محدود قسم کی صارفیت(consumerism)پیدا کرناتھا؛ اس میں کھیلوں کے بیرو ، مقبول عام گلوکار اور باکی کی پسندیدہ ٹیمیں بھی موجود تھیں۔ یہ زندگی جن اقدار کو جنم دیتی تھی ان میں وفاداری ، تابعداری، نپی تلی رجائیت ، نظم ، و ضبط ، کام کی بابت مثبت رویہ، اور مساوات شامل تھیں۔ سرکاری طور پر نسل پرستی، قوم پرستی اور نو آبادیت کو مسترد کیا جاتا تھا؛ سرکاری طور پر غریبوں ، مظلوموں، اور غیر سفید لوگوں سے یکجھتی کا اظہار کیا جاتا تھا۔ یہ نظام لوگوں میں کاروباری ذوق و شوق ، ضرورت سے زائد دولت، تنقید اور کسی بھی قسم کے گہرے غور و فکر کی بابت ایک طرح کی معاندت پیدا کرتا تھا، جس کے معنی یہ ہوے کہ یہ نظام تخلیقی دانش وروں سے عناد رکھتا تھا (اور یہ اجرت ان کاموں پر بھی دی جاتی تھی جو حقیقی معنوں میں کام نہیں بلکہ کام کا سوانگ ہوا کرتے تھے)، مفت تعلیم کی ضمانت دیتا تھا( جو، خواہ نظام اسے کتنا ہی قابو میں رکھنے کی کوشش کرے، کبھی کبھی واقعی تعلیم ہوتی تھی) ، او ر مفت طبی سہولتوں کی بھی ضمانت دیتا تھا، جن کا معیار خواہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پست ہوتا چلا گیا ہو، مگر اس کے باوجود وہ سماجی تحفظ کے مجموعی نظام کا حصہ رہیں۔

پولیس اسٹیٹ ہر شہری کی نقل و حرکت کو کنٹرول کرتی اور، خاردار تاروں کی مدد سے ، ملک کی سرحدوں کی حفاظت کرتی تھی۔ اگر چہ اس کا مطلب اکثر صورتوں میں نفیس شہریوں کو اندر قید رکھنا ہوتا تھا، لیکن ساتھ ساتھ بین الاقوامی جرائیم کی بد ترین شکلوں کو اندر آنے سے روکنا بھی تھا۔ یہ علم لوگوں کے شعور میں پوری طرح جڑپکٹر چکا تھا کہ ریاست ان کی دیکھ بھال کر رہی ہے، بلکہ یہ بھی کہ یہ ریاست کا فرض ہے ، اور کوئی اوسط درجے کا شہری خود کو مقابلتا اس سے کچھ زیادہ محفوظ خیال کر سکتا تھا جتنا آج ایک جمہوری معاشرے میں کر سکتا ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ لوگوں نے کس طر اس نظام اور اس سے پیدا شدہ کلچر سے بغاوت کی، غیر شعوری طور پر انھوں نےاس کے بہت سے پہلوؤں کو تسلیم کر لیا تھا اور ، میں تو یہاں تک کہوں گا، اگر چہ قدرے سادہ بیانی کے ساتھ ، کہ اس نظام کے تحت زندگی بسر کرنے والے لوگوں نے پانے اندر دانستہ طور پر ایسی خصوصیات پیدا کرلی تھیں جو آزاد حالات میں پروان چڑہنے والے لوگوں کی خصوصیات سے مختلف تھیں۔

جو لوگ اس طرز زندگی کو قبول کرنے سے انکار کرتے ، یعنی جو اس نظام کی دروغ گوئی اور منافقت کے پردے کے پار دیکھ لیتے ، ان کےساتھ اکثر سختی کا برتاتھا۔ انھیں مادی طور پر نقصان اٹھانا پڑتا، لیکن شاید اس سے بھی بڑھکر اکثر سختی کا برتاو کیا جاتا تھا۔ انھیں مادی طور پر نقصان اٹھانا پڑتا، لیکن شاید اس سے بھی بڑھ کر انھیں ذہنی اور روحانی تکلیفیں برداشت کرنی پڑتیں: آزادی سے محرومی ، اطلاعات سے محرومی، قسم قسم کی پابندیا جو ان کی زندگی کے قریب قریب ہر سطح کو متاثر کرتی تھیں۔ اس حقیقت کا احساس کرنے پر کہ وہ آزاد دنیا سے کٹے ہوے ہیں۔۔ جو فاصلے دیکھنے کے باعث غلوآمیز ھد تک دلکش رنگوں میں نہائی دکھائی دیتی اور غیر محدود امکانات ، بے پناہ افراطاور مکمل آزادی کی دنیا معلوم ہوتی تھی۔۔۔ وہلوگ طیش میں آجاتے اور انھیں محسوس ہوتا کہ ان کی زندگیوں کا کوئی مستقبل نہیں ہے جس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس پورے سماجی نظام ہی کا، جس میں وہ رہ رہے ہیں، کوئی مستقبل نہیں ہے۔

اس قسم کی ذہنی صورت حال سے محض آمیریت کے خلاف حقارت ہی پیدا نہی ہوتی تھی؛ اس سے یہ خال بھی جنل لیتا تھا کہ ایک آزاد معاشرہ (آمریت کے اس پرپینگنڈے کے باوجود جس کا مقصد انھیں اس کے برعکس مقین دانا تا ) تمام انسانی مسائل حل کرنے پر قادر ہے، کہ ایسا معاشرہ تمام سماجی اور ذاتی معاملات کے خوش اسلوبی سے ترتیب پاجانے کا مکمل نمونہ بن گیا۔ صارفانہ زندگی کی جعلی اقدار سے خبر داری او ر ماس کلچر کے سیلاب کی مذاحمت ، جو یوروپ کے آزاد حصے کی ثقافتی آب و ہوا میں منقود تھے۔ سابقہ آہنی پردے کے مشرق میں آباد بیش تر لوگ 1989 کے بعد تر حالات میں یوں داخل ہوے کہ ان کی ثقافتی تیاری ناپیدا تھی، کھلے بازار ر مبنی معاسرت اور اس کے ماس کلچر میں پوشیدہ مستقل بیماریوں کے جراثیم (جو انسان کی پیدا کردہ ہر صورت حال میں مضمر ہوتے ہیں) کی مدافعت کے لیے مثبت جراثیم ان کے اجسام میں موجود نہیں تھے۔

انقلاب کے بعد کے پہلے چند مہینوں میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب سے بڑھ کر ان چیزوں کو عروج نصیب ہو رہا ہے جنہیں سابق آمریت نے ممنوع قرار دے رکھا تھا۔ مثال کے طور پر ادب میں اختلاف راے رکھنے والوں (dissidents) کی تحریریں اور کثیر تعداد میں بکنے والے مغربی مصنفین (مثلاً ہے ایم سیملیا اسٹیفن کنگ)، یا ویسٹرنیا ایکشن اسٹوری کی تکرار پر مبنی خالص غلافت، دونوں قسم کی مطبوعات فوری طور پر مقبول ہو گئیں۔ تھیٹر کی مقبول ہونے والی چیزوں میں بیکٹ پا یونسکو کی تخلیقات بھی تھیں اور Les Miserables کے میوزیکل روپ جیسے ڈرامے بھی۔ لوگ محض نجس کے زیراثر تھے۔ واکلاو باویل (Vaclav Havel) کی پہلی کتاب خریدنے کے خواہش مند لوگوں کی قطار ایک کلومیٹر لمبی تھی۔ ڈیڑھ کروڑ کی آبادی کے ملک میں اختلاف رائے رکھنے والے ادیبوں کی تحریریں ایک ایک لاکھ کے ایڈیشنوں میں شائع ہوئیں۔ لیکن بہت جلد بیکٹ آدھے خالی تھیٹروں کے ذخیروں سے غائب ہو گیا اور مشہور ترین ملکی ادیبوں کی تحریروں کے ایڈیشن بھی گھٹ کر ہزاروں کیتعداد پر پہنچ گئے۔ اس کے برعکس کوڑے کرکٹ نے کلچر کے تمام مظاہر میں اپنا فاتحانہ مارچ شروع کر دیا۔ تجس کی تسکین ہو چکی تھی، اور اوسط در جے کا ذوق ، جسے اب کسی قسم کی ہدایتیا رہنمائی حاصل نہیں تھی ، پیش منظر پر ابھر آیا تھا۔

ان انقلابی تبدیلیوں نے کلچر کے تمام پہلوؤں کو متاثر کیا، جن میں نظام اقدار بھی شامل تھا۔ کل جو کچھ درست سمجھا جاتا تھا، آج اس میں سے کوئی شے بھی درست نہیں رہی، اور جو کچھ ناخوب تھا وہ آج خوب ہو گیا۔ اگرچہ اکثر لوگ اس تبدیلی کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں ، لیکن ہر شخص اس سے مطابقت پیدا کرنے کا اہل نہیں ہے، اور معاشرے کی تمام مسلموں کو ایک قسم کے ثقافتی صد مے نے بلا کر رکھ دیا ہے۔

وہ لوگ جو سابقہ نظام کی سادہ ترتیب اور خیالات کے عادی ہیں (اور بہر حال لوگوں میں نعروں اور سادہ حلوں کے اثر میں آ جانے کا رجحان ہمیشہ زیادہ قوی ہوتا ہے ) اکثر غیر شعوری طور پر پرانے نظریوں کے متبادل تلاش کرتے ہیں، نئے توہمات کی جستجو کرنے لگتے ہیں جو موجودہ صورت حال کی افراتفری کی دهند صاف کر سکیں۔ ایسا ہی ایک مقبول عام واہمہ یہ ہے کہ کھلے بازار کی معاشرت تمام بنیادی مسئلوں کو آپ ہی آپ حل کر لے گی۔ میں معاشیات کے علم میں درک نہیں رکھتا اور نہیں کہہ سکتا کہ معاشی میدان میںیہ دعوی کس حد تک معقول ہے، لیکنیہجانتا ہوں کہ کلچر کے میدان میںیہ بات کچھ زیادہ درست نہیں ہے۔

ہمارے ملک میں آنے والییہ تبدیلیاں ، قابل لحاظ حد تک، دانش وروں کی کوششوں کا نتیجہ تھیں ، آنے والییہ تبدیلیاں، حد کا ، مگر خود فنکاروں نے بھی ان تبدیلیوں میں اہم کردار ادا گیا۔ ان سب کو آج و کچھ حاصل ہے جسے کسی بھی تخلیقی سر گرمی میں سب سے اہم سمجھا جا سکتا ہے، یعنی مکمل آزادی۔ اس کے باوجود ان میں بہت سے افراد، اور ان کے ساتھ ثقافتی طور پر بیدار عام لوگ بھی ، حالیہ تبدیلیوں سے مایوسی نہیں تو کم سے کم بے اطمینانی ضرور محسوس کر رہے ہیں ۔

بہت سے غیر مفاہمت پسند (non-conformist) فنکار، حکومت کی جانب سے زیادتیوں کا نشانہ بننے کے باوجود، تعلیمیافتہ عوام کی جانب سے غیر معمولی احترام کے عادی ہو چکے تھے۔ انھیں عوام کا ترجمان سمجھا جاتا تھا، اور اکثر صرف وہی ان باتوں کا اظہار کرتے تھے جو دوسرے لوگ سوچتے تو تھے لیکن کھنے کی ہمت نہ رکھتے تھے۔ انقلاب کے بعد یہ خاصا مراعات یافتہ مقام غائب ہو گیا۔ اب معاشرے کے بارے میں حقائق کا اظہار کرنے کے لیے غیر معمولی جرات در کار نہیں ہے، اور عوام کے سابق ترجمان اب وہی کچھ ہو چکے ہیں جو فنکار آزاد دنیا کے ہر حصے میں ہوتے ہیں : یعنی فقط فنکار ۔

سابق آمریت کے دور میں بیش ترفنکار ۔۔ حتی کہ مفاہمت پسند فنکار بھی۔۔ اس قسم کا خواب دیکھا کرتے تھے کہ اگر کبھی انھیں آزادی نصیب ہوئی تو وہ کیا کیا کارنامے انجام دیں گے۔ اداکار ، فلم ڈائرکٹر ، ادیب، ممکنه ناشر ، فلم ساز اور ٹیلی وژن کے کارکن ، سب کا یہی خواب تھا۔ یہ اس " تیسرے راستے کے تصور کا ایک پہلو تھا جسے بڑے مبہم انداز میں بیان کیا جاتا تھا: کہ آمریت کے خاتمے کے بعد ریاست آرٹ کی سر پرستی جاری رکھے گی، مگر اس کے ساتھ ساتھ آرٹ کی تخلیق کرنے والوں کو مکمل آزادی بھی دے گی اور کوڑے کرکٹ کے پھیلاو کو روکنے کا کوئی انوکھا طریقہ بھی ڈھونڈ نکالے گی۔ اس بات کا احساس مشکل ہی سے کسی کو ہوا ہو گا کہ مکمل آزادی اگر ان کو حاصل ہو گی تو باقی سب کو بھی حاصل ہو گی۔ یہ خیال بہت کم لوگوں کے ذہن میں آیا کہ انھیں مسابقت کا بھی سامنا کرنا ہو گا، اوریہ احساس تو شاذ ہی کسی کو ہوا ہو گا کہ کیا چیز خریدی جائے، اور پھر اسے بڑی تعداد میں تیار کر کے عام فروخت کے لیے رکھا جائے، یہ تمام فیصلے اوسط در ہے کے پڑھنے یا دیکھنے والے کے ذوق اور مفاد کو سامنے رکھ کر کیے جائیں گے۔

اچانک، تقریباً راتوں رات، معاشرے نے خود کو کھلے بازار کی معیشت کی آزاد صورت حال میں پایا، اور تب ہر چیز اس تصور سے قطعی مختلف تھی جو خواب دیکھنے والوں کے ذہن میں قائم تھا۔ اپنے دہشت ناک مگر مانوس دشمن ۔۔سنسر ۔۔ کے بجاے ان کا سامنا بازار سے ہوا۔ بازار کے لیے خواب بے مصرف چیز ہیں، اسے تو سرمایہ، تجربہ، حوصلہ، بے پناہ محنت، قوت فیصلہ اور صلاحیت در کار ہوتی ہے۔ آزادی کے خواب دیکھنے والوں میں سے بیش تر ان اثاثوں میں سے ہر ایک سے، یا تقریباً ہر ایک سے ، محروم تھے۔ وہ سخت صدمے کی حالت میں دیکھتے رہ گئے اور کوڑا کرکٹ (اور وہ بھی غیر ملکی برانڈ کا کوڑا کرکٹ ان کی آرٹ کے اور آزادی کے ماحول میں تیار ہونے والی اور بے تابی سے ہاتھوں ہاتھ لی جانے والی تخلیقات کے خوابوں کی پسلیوں میں کہنیاں مار کر آگے نکل گیا، اور ان کے پڑھنے یا دیکھئے والوں نے، جن سے انھوں نے اتنی مفروضہ امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں، مستند تخلیقی کارناموں کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں اور ان پر نہایت سطحی صارفانہ اشیا کو ترجیح دینے لگے۔

اس میں شک نہیں کہ حالیہ واقعات کا نتیجہ بعض ثقافتی نقصانات کی صورت میں برآمد ہوا ہے۔ چیک اینی میٹڈ اور کٹھ پتلیوں کی فلمیں جو کبھی دنیا بھر کی بہترین فلموں میں شمار ہوتی تھیں ، ڈزنی کی سوقیانہ پیداوار سے شکست کھا گئی ہیں۔ یہی بات غالباً چیکوسلووا کیا کے بچوں کے ادب کے بارے میں کہی

جاسکتی ہے، جس میں بچوں کی کتابوں میں شامل تصویر میں بھی شامل ہیں جو بہترین چیک مصوروں کی کئی دہائیوں کی کوششوں کا ثمر تھیں۔ چیک سنیما، جو ۱۹۶۰ کی دہائی میں بہترینیوروپی سنیما میں شمار کیا جاتا تھا، نہایت پست حالت میں ہے اور زیادہ تر کامیڈی، پور نو گرافی اور ایکشن فلموں کے ملغوبے تیار کر رہا ہے۔ تھیٹر اتھلی، بے تہ کامیڈییا میوزیکل پیش کشوں کی غذا پر زندہ رہنے کے لیے کوشاں ہے۔ ثقافتی جریدے مر رہے ہیں، کیوں کہ اپنے پڑھنے والوں سے محروم ہو چکے ہیں۔ انقلاب کے بعد نمودار ہونے والے دو ہزار کے لگ بھگ اشاعتی اداروں میں سے بہت سے کوڑے کرکٹ کی پیداوار میں اختصاص رکھتے ہیں اور عظیم بازاری کامیابی سے ہم کنار ہور ہے ہیں۔

عوام ، جو ذاتی انتخاب کے اس اچانک دھماکے سے دوچار ہونے کے لیے تیار نہیں تھے ، اپنی ذہنی ترجیحات سے بے خبر ہیں اور ایک ڈھلمل یقین منڈی کی تشکیل کر رہے ہیں ۔ فنون کے درسی ماہرین ، جو شاید سنجیدہ تخلیقات کے خریدار ہو سکتے تھے، اتنی کم تنخواہ پاتے ہیں کہ ان کے پاس کلچر کے لیے کوئی رقمنہیں بچتی۔

لیکن اس صورت حال کا مثبت رخ بھی موجود ہے : " تیسرے راستے کا سراب اب غائب ہوتا جا رہا ہے اور کلچر کی تخلیق کرنے والے ، پہلی بار ، معاصر دنیا میں اپنا مقام متعین کرنے کے اہل ہو گئے ہیں۔ دوسری جانب بد قسمتییہ ہے کہ ثقافتی میدانوں میں ہم لوگ آزاد دنیا کے تجربات سے بہت کم سبق حاصل کر سکتے ہیں ؟ یہ کہ ٹیلی وژن کے اسکرین تشدد سے مغلوب ہیں ، یہ کہ دیہی دکانیں جن میں ابھی کچھ دن پٹے تک، ضرورت کی دوسری اشیا کے ساتھ ساتھ ، کلاسیکی ادب پاروں یا بچوں کے بہترین ادب کے ایڈیشن بھی مل جایا کرتے تھے، اب صرف باریکین رومانس اور کومکس سے اٹی ہوئی ہیں ، اور یوں خریداروں کو نہ صرف انتخاب سے محروم کر رہی ہیں بلکہ ان کے ذوق کو پست بھی کر رہی ہیں۔

ہمارا معاشرہ ایک نہ ایک دن اس ثقافتی صدمے کے اثر سے نکل آئے گا۔ آج بھی متعدد ناشر اور کتب فروش سنجیدہ ادب کی اشاعت اور فروخت پر توجہ دے رہے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے پبلک ٹیلی وژن کے دو چینلوں میں سے ایک باذوق ناظرین کے لیے پروگرام نشر کرنے پر زور دے رہا ہے۔ ریاستی اور نجی شعبے دونوں میں مالی اعانت کے ایسے ادارے قائم کیے جا رہے ہیں جنھوں نے آرٹ کی سنجیدہ تخلیقات کے فروغ کو اپنا مقصد ٹہرایا ہے۔

سنسر شپ کے برعکس بازار کی معیشت آزادانہ انتخاب کی گنجائش فراہم کرتی ہے۔ اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں ہے کہ جو لوگ آرٹ کے مستقبل کے بارے میں سوچتے ہیں ، جن کو یقین ہے کہ انسانی زندگی کے بنیادی معنی بے مقصد اور محض وقت گزاری کی تشریح میں پوشیدہ نہیں ہیں، ان کا یہ حق ، بلکہ فرض ، نہیں بنتا کہ وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنے موقف کا قائل کرنے کی پوری کوشش کریں۔

٭٭

**جونا تھن ٹرائٹل**

ـــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــ

انگریزی سے ترجمہ : افضال احمد سید

**اسٹالن ، اسٹالن اور اسٹالن**

اسٹالن کے (ریٹائرڈ ) ہمشکلوں کی انجمن کا پہلا سالانہ اجتماع گریٹ ہال آف دی یونین کے بینکوئٹ چیمبر میں خزاں 1953 میں منعقد ہوا۔ یہ ایک تاریخی واقعہ تھا۔ سنگ سماک اور مر مر کے ستون عشائیے کی جگہ کو گھیرے ہوے تھے۔ برقی فانوس اپنی بے شمار روشنی برسا رہا تھا۔ طویل چمکدار میز گلٹ کے کناروں والے بلوری گلاسوں ، کلف لگے نیپکنوں (جن پر ہتھوڑے اور درانتی کے مونوگرام بنے تھے) اور نقرئی کاروبار کی قابوں سے آراستہ تھی۔ ایک پوری دیوار کا احاطہ کیے ہوے، ہمارے اور پر جھکتا ہوا، اسٹالن کا زندگی سے فزوں تر پور ٹریٹ تھا۔

چونکہ اسٹالن کی وفات کو صرف چند مہینے گزرے تھے، ہمارا ایک دوسرے سے کسی سماجی تقریب میں ملنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ ہم میں سے کچھ جو ملک کے زیادہ الگ تھلگ حصوں میں کام کر چکے تھے، اس سے پہلے کسی اور اسٹالن کے رو برو نہیں آئے تھے اور کسی انسان کا یہ گمان رکھنا کہ دنیا میں اس جیسا ( اصل اسٹالن کے سوا کوئی اور نہیں ہے، کچھ ایسا غیر متوقع نہیں تھا۔ اس بات پر اصرار کرنا چاہیے کہ ہم مماثلت میں ہو بہو ایک جیسے نہیں تھے۔ اسٹالن کی شکل صرف مثالی پور ٹریٹوں ، خط و خال ابھارے ہوے فوٹو گرافوں اور گاہے بہ گا ہے دھندلی نیوز فلموں سے پہچانی جاتی تھی ، اس لیے کسی کو امید نہیں تھی کہ ایک اسٹالن گوشت پوست میں تصویری وجود کے بالکل مماثل ہو گا۔ اس کے علاوہ بھی، ہم میں سے گئی اس وقت تک اپنی مونچھیں صاف اور اپنے بالوں کا انداز تبدیل کر چکے تھے۔ اس کی ایک سمت مثال واحد موجود خاتون (اسٹالن بیست و هفتم : اصل نام اول کا کبیروت، ازولادی وستوک ) تھی، جس نے اپنی مونچھیں اکھاڑ دی تھیں اور بالوں کے بلونڈ پرم کا انتخاب کیا تھا۔ اب وہصرف اپنے جبڑوں کی مخصوص چوکور ساخت اور آنکھوں کی سردمہری کی وجہ سے ایک سابق ہمشکل کے طور پر دشواری کے ساتھ شناخت کے قابل رہ گئی تھی۔

ابتدا عام گفتگو سے ہوئی۔ پھر ہم کچھ کھلے۔ ہم نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ کون اسٹالن کے کس (عسکری، زرعی، تغیراتی وغیرہ) پہلو میں شامل تھا۔ خوش قسمتی سے یادداشت بڑھانے کی تکنیک کا کورس ہماری تربیت کا لازمی حصہ تھا۔ ایک ہمشکل کے لیے ضروری ہے کہ اسے معلوم ہو کہ اسے کس سے ہاتھ ملانا ہے، کے سلیوٹ کرنا ہے، کس کا دونوں گالوں پر بوسہ لینا ہے، کس کے پاس سے نظر ڈالے بغیر گزر جانا ہے ۔۔ اس لیے ہم بہ آسانی ناموں کو چہروں سے جوڑنے کے اہل تھے۔ چھوٹے چھوٹے دل چسپ واقعات سننے میں آتے رہے، جیسے اسٹالن یازدہم نے پنج سالہ پلان مکمل کرنے والے کسانوں کی ایک کا نفر نس سے سلینو گراڈ میں عین اسی لئے خطاب کیا تھا جب اسٹائن سوم اسی طرح کے ایک اجتماع کو سیمی پلائینسک میں اپنی موجود گی سے سرفراز کر رہا تھا۔

اب ہمیں مہا گنی کی میز کے گرد اپنی نشستیں سنبھالنی تھیں ۔ اس تقریب کے منتظم، اسٹالن چهارم (اصل نام موشے سیگال، از و تیبک) نے ایک مختصر تقریر کی۔ وہ، جیسا کہ پتا چلا، ہم میں سے واحد فرد تھا جو ابھی تک سابقہ خدمات پر بحال تھا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ وہ بستر مرگ کے مناظر کے لیے پوز کرنے میں مصروف رکھا گیا تھا، اور مادروطن کو امپیریا سیٹوں اور غذاروں سے لاحق دائمی خطروں کے پیش نظر ، اور صورت حال میں کہ جانشینی مالکوٹ اور خروشچیف کے درمیان متنازعہ ہے، اسے پوری توقع تھی کہ نیم دھڑ مجسموں ، ڈا یوراموں اور اس طرح کی اور اشیا کی طلب آنے والے چند برسوں تک کم نہیں ہو گی۔ حالاں کہاس کے موجودہ کام کا (اس نے اعتراف کیا ) زندہ رہنما کی جگہ کھڑے ہونے کی سنسنی خیزی سے بہ مشکلہی موازنہ کیا جاسکتا ہے، پھر بھی اس نے خود کو خدمت کے قابل سمجھے جانے اور اپنا کام جاری رکھنے پر افتخارمحسوس کیا۔ وہ پر یقین تھا کہ ہم سب اس کے جذبات میں شریک ہیں۔ (تالیاں۔) یہ تاریخ کی منطق تھی جس نے اسٹالن کو صف اول میں پہنچایا، اور یہ تاریخ کی منطق تھی جس کا تقاضا تھا کہ اسٹالن کو اپنے ہمشکل رکھنے چاہییں۔ (زیادہ تالیاں اور مشفقہ اثبات کا شور - )

ہم کھڑے ہو گئے۔ وود کا کا دور شروع ہوا: بوتل ہر بار بائیں طرف کو آگے بڑھائی گئی۔ گلاس بلند کیے گئے۔ کامریڈو! اسٹالن کے نام پر! - جام نوش کیا گیا اور پھر، بیک وقت، ہم نے گلاسوں کو اپنے شانوں کے اوپر اچھالا اور وہ دیواروں اور ستونوں سے ٹکرا کر چور ہو گئے اور فرش رنگین کرچیوں سے بھر گیا۔ اب ہم زیادہ پرسکون تھے۔ ہر ایک اپنی باری پر اپنا سب سے زیادہ ناقابل فراموش تجر بہ بیان کیا۔ چند ایک اسٹالن کی آواز ( ناگوار گھر درا جورجیائی لمحہ ) بروے کار لائے، جب کہ آوروں نے اپنی روزمرہ کی آواز کے استعمال کو ترجیح دی۔ بہر حال، کئی ہمشکل محض بصری تھے، جیسے اسٹالن سیز دہم (اصل نام رحیم محمدون ، از باکو)، ایک سادہ لوح شخص جسے روسی زبان کے صرف چند الفاظ آتے تھے : ہیلو، کامریڈ

شکریہ۔ کئییادداشتیں بہت متاثر کن تھیں۔ اسٹالن پنجم نے ایک ملٹری اسپتال کالینن گراڈ کے محاصرے کے بعد کی تباہی کے وقت دورہ کیا تھا: زخمی سپاہیوں نے اسے دیکھ کر فلک شکاف نعرے لگائے تھے: اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اسٹالن بیست و یکم کراسنو پارسک کے اجتماعی فارم کے کنڈرگارٹن میں ایک ہے کو تھپتھپا رہا تھا کہ بچے نے مڑ کر اس کے ہاتھ کی انگشت شہادت اور انگوٹھے کے درمیان نرم حصے کو کاٹ لیا تھا۔ اسے اپنی چیخ روکنی پڑی تھی تمھیں زیادہ جوشیلے باڈی گارڈ ہے اور اس کے خاندان کو نیست و نابود نہ کر دیں۔ دوسروں نے بھی اسٹالن پر نادر روشنی ڈالی۔ چند لوگوں کو معلوم تھا، مثال کے طور پر، کہ پوٹسڈام کانفرنس کے دوران وہ اپنی پشت پر ایک تکلیف دہ پھوڑے کو ستا رہا تھا (اسٹالن نہم نے ہمیںیہی بتایا )، یا ( اسٹالن بیستو یکم کے مطابق ) وہ کبھی کبھی اپنا ٹوتھ برش چہا جاتا تھا۔ چند اسٹالن ان واقعات کے جلسے میں سنائے جانے کا غلط مطلب لیتے نظر آئے۔ اسٹالن پانزدہم نے بریچ کے جنگلوں کے حسن کے بارے میں ایک چھوٹا سا نغمہ سنایا۔ اسٹالن سیم نے بتایا کہ وہ اپنی بیوی سے کتنی محبت کرتا ہے۔

پھر منتظم نے ایوسف ویساریو نووی ژو کاشویلی کی مدن میں ایک نظم “ پڑھ کر سنائی۔ مزید جام نوش کیئے گئے۔ پارٹی کے لیے بالکون کے لیے اخرو شیت کے لیے ! تاریخ کے لیے! کاویار کھایا گیا۔ جورجیائی تمھیں خوش آہنگی سے قتل کرتی رہی۔ سادہ مگر تسکین بخش کھانا میز پر آیا اور ختم کیا گیا۔

آخر میں منتظم کھڑا ہوا اور اس نے اعلان کیا کہ اگر یہ اصل میں اجتماع صرف ایک بار کے لیے سوچا گیا تھا ، اب جب اسے اتنی پر جوش کامیابی حاصل ہوئی ہے ، کیوں نہ ہم اگلے سال، اس کے بعد کے سال ، اور اسی طرح ہمیشہ آتے رہیں؟ (زوردار تالیاں) "اسٹالن زندہ باد!"

چند اسٹالنوں نے جو دور اُفتادہ جمہوریاؤں سے تعلق رکھتے تھے، خیال ظاہر کیا کہ اگلا اجلاس موسکو سے باہر ہونا چاہیے۔ اس پر اتفاق کیا گیا۔ پھر کہاں ؟'' اسٹالن گراڈ پر ، علامتی لحاظ سے ایک موزوں شہر کی حیثیت سے، بحث ہوئی۔ اسٹالنگ اور اسٹالنو کے نام بھی تجویز کیے گئے۔ بہر حال تین مقامات جو سب سے زیادہ حمایت حاصل کرتے نظر آئے، وہ شہر تھے جو بعد میں براسون ، وار نا اور دو نیتک کے نام سے جانے گئے، مگر اس وقت ان کے نام بالترتیب اسٹالن، اسٹالن اور اسٹالن تھے۔ بہت غور وفکر کے بعد یہ قرار پایا کہ ہم اگلے سال اسٹالن میں دو بارہ جمع ہوں گے۔

۱۹۵۴ کا اجتماع مختصر اور کئی اعتبار سے گذشتہ سال کے مقابلے میں زیادہ بے تکلفانہ انداز میں تھا۔ میز کی شکل گول تھی۔ اسٹالن کا ایک پلاسٹک کا نسیم وحر مجسمہ سنٹر ہیں کے طور پر خشک فرن اور کانٹے دار پنیوں کے بستر پر سجایا گیا تھا۔ اس بار سارے بمشکل شرکت کو نہیں آئے۔ بعضوں کے لیے سفر کا فاصلہ مان تھا اور بعض کو ناگزیر مصر وفیات پیش آ گئی تھیں۔ جو حاضر ہوئے، جہاں تک ان کا تعلق ہے ، کچھ ھتی ہوئی عمر کے باعث (اسٹالن سیز دہم کے گال چونکا دینے والی حد تک پھول چکے تھے۔ اسٹالن نواز دہم آدھا گنجا ہو چکا تھا)، اور کچھ مردانہ فیشن میں تبدیلیوں کی وجہ سے ، ان کی اصل سے مشابہت ماند پڑ گئی تھی۔ مگر ایسی باتوں کی توقع ضرور رکھنی چاہیے تھی: اگر آج اسٹالن زندہ ہوتا تو وہ خود بھی بہت زیادہ اسٹالن کی طرح نہ ہوتا۔

حسب دستور جام نوش کیے گئے۔ پارٹی کے لیے ! خرو شچیف کے لیے ! مالنکوف کے لیے! اسٹالن کے لیے ! تاریخ کے لیے ! " آپ کیش کاویار کو بہت سراہا گیا۔ سفید وائن خوش نما نازک گلاسوں میں انڈیلی گئی۔ خوش مزاجی کی تمام تر فضا کے باوجود اجتماع میں اس وقت تیک گذشتہ سال کی سی ترنگ نہیں تھی -- ماضی کی کامیابی کو دہرانے کی کوشش ہمیشہ غلط ثابت ہوتی ہے۔ پھر اسٹالن دوازدہم نے (اصل نام سرگئی بالن ، از موسکو)، جو اس وقت ایگر و نومیکل ڈویلپمنٹ انسٹیٹوٹ میں ٹیلی فون آپریٹر کے طور پر کام کر رہا تھا، اپنی تحقیقات کے نتائج ظاہر کیے۔ اس نے بیان کیا کہ وہ اس مفروضے پر کام کر رہا ہے کہ اسٹالن واحد سیاست داں نہیں رہا ہو گا جس نے اپنے ہمشکل رکھے۔ وہ دیگر عالمی رہنماؤں کے بمشکل افراد سے رابطہ کرنے کی کوششوں میں مشغول تھا۔

ہم نے اپنی سانسیں تھام لیں، گھومنے والے دروازوں کی طرف نظر ڈالی۔ دو بنگر، ہاتھوں میں گرینیڈ لیے، ڈیوٹی پر تعینات تھے۔ ہم نے تصور کیا کہ کسی بھی وقت بیسیوں پر چل اور روزویلٹیاشا کا نفر نس کو متعدد بار دہراتے ہوے اندر داخل ہو سکتے ہیں ، اور ممکن ہے کہ اس وقت بھی کئی لینن زندہ ہوں ، بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دو بار جعلی ٹراٹسکی سائبیریا سے مارچ کرتے ہوے آرہے ہوں ۔

بالن نے اپنے ہاتھ بلند کیے۔ اس نے افسوس کا اظہار کیا کہ اس کی پوری کوشش کے باوجود اسےکسی بصری بمشکل کی شہادت نہیں ملی مگر ۔۔ اور اس موقعے پر اس نے لاوڈ سپیکر سسٹم کو جو انٹر نیشنل سوئچ بورڈ سے منسلک تھا ، چلایا۔۔ اس وقت اس کے پاس لائن پر لندن سے نارمن جو نز نامی ایک شخص تھا۔ جونز کی آواز زیادہ تر بلند اورر صاف تھی، صرف کہیں کہیں ذرا تڑخ جاتی تھی اور اس کے ساتھ عجیب طرح کی ہلکی سی گونج آتی تھی۔ اس نے ہمارا روسی میں خیر مقدم کیا اور بتایا کہ وہ اپنے وقت میں ایک چرچل تھا۔یہ کوئی خاص کام نہیں تھا، خیال رہے، وہ صرف وائرلیس پر اُس کی تقیریں پڑھا کرتا تھا اور اصل وزیراعظم کے دیے ہوے خطبات کو دوبارہ ریاستہاے متحدہ اور نو آبادیات کو ٹرانسمیشن کےلیے ریکارڈ کرایا کرتا تھا۔ ہمیں محظوظ کرنے کےلیے اس نے اپنے سدابہار پسندیدہ چٹکلوں کا ایک انتخاب پیش کیا:

‘Blood, toil, tears and sweat.’ ‘ Some cicken. Some neck.’ ‘we ‘ An iron curtain shall fight on the beaches.’اس کا جملہhas descended

Across te continent’شاید بالکل دوستانہ نہیں تھا، مگر ہم میں سے وہ بھی جو انگریزی سے ناواقف تھے، جونز کی کسی نقص سے عاری غراہٹ اور لکنت اور اس کی نقلی دانتوں سے تھوک نگلنے کی ماہرانہ نقل سے بجا طور پر متاثر ہوے۔

اور امریکیوں کا کیا بنا؟ بے چارے ناتواں روزویلٹ نے ضرور اسٹنٹ مینوں کو اپنی زیادہ اہم مصروفیات سے نبٹنے کے لیے بھیجا ہوگا۔ مگر بظاہر ایسا نہیں ہوا؛ کم از کم کوئی روزویلٹ ثانی سامنے نہیںآیا۔ اس کے علاوہ، جیسا کہ اسٹالن بشتم (اصل نام بورس باکیف، از کیف) نے نشان دہی کی، اگر روزویلٹ کا کوئی ہمشکل ہوتا تو صدر کو ۱۹۴۵ میں ایسے نامناسب موقعے پر مرنے نہ دیا جاتا۔ جب تک جنگ کا اختتام نہ ہو جاتا، اس کا ہمشکل اس کا کردار ادا کر سکتا تھا۔

اس بات پر ہم سب کے ذہن میں ایک ہی سوال ابھرا: اسٹالن کو کیوں مر جانا پڑا؟ بلاشبہ اس کمرے میں موجود ہم میں سے کوئی بھی پارٹی کے چیئر مین اور ملک کے رہنما کے طور پر قابل قبول خدمت انجام دے سکتا تھا۔ ہم مشعل کو آگے لے جاسکتے تھے۔ کیا اسٹالن کو مرنے کی واقعی ضرورت تھی ؟ اسے عمل لافانی بنانے کے لیے ہمشکلوں کی نئی نسل منتخب کی جاسکتی تھیاور انھیں تربیت دی جاسکتی تھی۔ انگلستان سے رابطہ منقطع ہو چکا تھا۔ شراب ختم ہو چکی تھی۔ یہ ہم سب لوگوں کے لیے گھر واپس جانے کا وقت تھا۔

تیسرا اجلاس اکتوبر ۱۹۵۵ میں اسٹالن (وہ اسٹالن نہیں جو گذشتہ سال کے اجلاس کا شہر تھا میں مقامی پارٹی کے مرکز کے پاس ایک کمرے میں ہوا۔ شاید اس کی تشہیر اچھی طرح نہیں کی گئی تھییا ہوٹل ریزرویشن کی دشواریاں تھیں، صرف در این بعد یا باندرہ بمشکل حاضر ہوے۔ اسٹالن کا رنگین ریپروڈکشن سماوار کے اوپر دیوار پر ایک چوکھٹے میں لگا تھا۔ کسی اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ زیادہ دوستانہ اور راز دارانہ موقع تھا۔ جام کئی بار تجویز کیے گئے ابرائی کے لیے ! خروشچیٹ کے لیے! اسٹالن کے لیے! تاریخ کے لیے! اس سال کاو بار دستیاب نہیں مگر بورش سوپ غیر معمولی طور پر تھا۔ چند زیادہ خوش مزاجاسٹالنوں نے ۔۔ میں انھیں ہنگامہ پرور نہیں لکھوں گا۔۔ اسٹالن کے چہرے کے تاثرات (گریم النفس مسکراہٹ، عوام کی حالت کے بارے میں تفکر کے انداز، زندہ دل مزدور کی دبی دبی ہنسی، تند خو نگاہوں کی نقل اتارنے کے ایک غیر رسمی مقابلے میں حصہ لیا۔ انعام کے طور پر اسٹالن دوازدہم کی طرف سے ایک تیز دھار استرا رکھا گیا تھا جس پر صابن کا جھاگ اور اسٹالن کی ٹھوڑی کے چند بال جھے ہوے تھے۔ اسے اسٹالن پانزدہم نے اس کے سخت گیر انداز میں گھورنے کی خوف زدہ کر دینے والی حقیقت آسا نقل کے زور پر جیت لیا۔

اسٹالن بیست و دوم (اصل نام ایوسف زا بارودون، از اولان با تور ) کھڑا ہوا اور گلا صاف کرنے کے بعد اس نے اعلان کیا کہ وہ ضرورت محسوس کرتا ہے کہ آج کے نوجوانوں میں اسٹالن کی بابت دل چسپی کے مکمل فقدان کی مذمت میں کچھ کھے ۔ اسٹالن نے اپنے بچپن میں جو دلیرانہ کام کیے (ذخیرہ اندوزوں سے جنگ، شروع کے سرمایہ داروں کو ناکام بنانا، مخبروں کو علانیہ مجرم ٹھہرانا ) اب اسکولوں میں بچوں کو سوشلسٹ طرز عمل کی مثالوں کے طور پر نہیں پڑھائے جاتے۔ اگرچہ اس کی تقریر اپنی روح میں ہمارے عمومی جذبات سے مطابقت رکھتی تھی ، پھر بھی تم میں سے بہتوں نے محسوس کیایہ بہت زیادہ سنجیدہ بلکہ افسر دو گرنے والی تھی، کیوں کہ بھر حال اجلاس کو ایک پرمسرت تقریب سمجھا گیا تھا۔ ہم جلد رخصت ہوگئے۔

۱۹۵۶ کا جلسہ آخری تھا۔ اس کا ہم سب کو علم تھا۔ شروع میں اس کو ستمبر میں اسٹالی نامیشہروں میں سے ایک کی پولیس بیرک میں ہونا تھا مگر شہر کا نام ایک ماہ پہلے تبدیل ہو گیا،یہ حقیقتاً کوئی نیک شگون نہیں تھا۔ اس کے علاوہ حاضری بھی کم متوقع تھی۔

اکتوبر کی ایک برفانی شام کو ہم موسکو کے مضافات میں تین منزلوں کے زینے چڑھ کر اور ایک پتلی راہداری سے گزر کر اسٹالن چہارم کے اپارٹمنٹ کے تنگ لونگ روم میں پہنچے۔ ہم تیزابی سبز رنگ کے صوفے اور باورچی خانے کی لڑکھڑاتی کرسیوں پر بیٹھے! چند تاخیر سے آنے والوں کو ظالمین پر ڈھیر ہونا پڑا۔ ہماری تعداد دس سے بھی کم تھی۔ اسٹالن کا ایک بلیک اینڈ وائٹ فوٹو گراف بک کیس کے ایک طرف پین سے اٹا تھا۔

اس دوران جو کچھ پیش آ چکا تھا وہ یوں تھا: اس سال فروری میں خروشچیف نے اسٹالن کے جرائم کا بیسویں پارٹی کانگریس کے ایک بند اجلاس میں اپنی طویل آتشیں تقریر کے دوران اعلان کیا تھا یہ واضح رہے کہ حکومتی طور پر یہ تقریر خفیہ مانی جاتی تھی ، مگر ہر شخص اس سے آگاہ تھا۔

خاموشی کو توڑنے میں کوئی پہل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ آخر کار اسٹالن چهار مرد جس نے تین سال پہلے مہاری انجمن کے پہلے شاندار اجلاس کا بندوبست کیا تھا، زیر لب بول پڑا ہ میں نے کبھییہ نہیں کہا تھا کہ وہ بے عیب ہے۔ ہم سب نے اس پر اتفاق کیا کہ غلطیاں ہر شخص سے ہو سکتی ہیں اور اس میں شک نہیں که - کہ استان نے بعض مواقع پر فیصلہ کرنے میں غلطی کی تھی ۔

کہ اسٹالن نے بعض مواقع پر فیصلہ کرنے میں غلطی کی تھی۔ اسٹالن دوازدہم نے بتا یا کہ اس نے سیرین کو ایک ٹرال کیائٹ قرار دیتے ہوے عدالت میں ایک عید آلود تقریر کی تھی اور شاید سیرین اصل میں بے قصور تھا۔ گذشتہ واقعات کے جائزے کے وقت انصاف پسند ہو جانا کتنا آسان ہے۔

ہم میں سے ہر ایک کے پاس اس طرح کے تجربات تھے۔ اسٹالن ششم نے ۳۸-۱۹۳۷ میں ولادی وستوک کے نواح میں افسروں کے کئی کھلے مقدمات میں اسٹالن کا کردار ادا کیا تھا، اس بات کو اچھی طرح جانتے ہوے کہ وہ سب کے سب جا پانی جاسوس، بادشاہت پسند یا ہم جنس پرست نہیں تھے۔ اسٹالن سیستم کو، جس نے تین سال ہوے ہمیں بتایا تھا کہ اسے اپنی بیوی سے کتنی محبت ہے، اپنے سسر کا علانیہ مجرم ٹھہرانا پڑا۔

اسٹالن ہند ہم ایک دوسرے ہم شکل، اسٹالن میشد ہم (مرحوم) کی ایک زینوویٹ کے پیرو علیحد گی پسند کی حیثیت سے گرفتاری تک کا ذمے دار تھا۔

در حقیقت ہم میں سے کوئی بھییہ دعوی نہیں کر سکتا تھا کہ اس نے اسٹالن کی شخصیت کے صرف بهتر پہلوؤں کے لیے اس کی نقل ادا کی۔ ہم سب کے دامنوں پر داغ تھے ۔ مگر ان تمام باتوں کے لیے (ہم نے دلیل دی) ایسا نہیں تھا کہ ہم ذاتی طور پر ذمے دار ہوں۔ بے شک اگر ہم propriis personis ذاتی حیثیت) میں عمل کر رہے ہوتے تو ہم نے ایسے سفاکانہ رویے کا تصور بھی نہ کیا ہوتا، مگر ہم تو صرف وہ کر رہے تھے جو اسٹالن نے، اگر وہ ان کاموں کے لیے وقت نکال سکتا، خود کیا ہوتا۔

کیا پوری داستان یہی ہے ؟ اسٹالن ششم نے یاد کیا کہ کئی بار جب اسے صرف غیر واضح ، مثال کے طور پر ایک کھلے مقدمے میں حاضر ہونے اور عمومی گواہی پیش کرنے کی، ہدایات ملی تھیں، اس نے ملزم کے خلاف ایک زہر آلود بیان دیا، جب کہ ایک نسبتا نرم سرزنش سے کام چل سکتا تھا۔ اور ہم میں سے ہر ایک اپنے تجربات سے اس طرح کے واقعات بیان کر سکتا تھا۔ ماضی کی طرف نظر ڈالتے ہوے احساس ہوا کہ ہمیں کردار کے بنانے میں کافی آزادی دی گئی تھی مگر شاید ہم خوں آشامی کو مبالغے کی حد تک گئے۔

اصل میں دیکھا جائے تو ہم ہمشکل اس بد نصیب عہد کے کئی المیہ پہلوؤں کے ذمے دار تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اسٹالن بذات خود معقول حد تک نرم خو رہا ہو۔ کاش ہم سے اسے سمجھنے میں غلطی نہ ہوئی !

وود کا کی بوتل صوفے کے نیچے لڑھک گئی تھی، اسے باہر نکالا گیا۔ گلاسوں ، پیالیوں، دانت صاف کرنے والے گوں اور بڑے پیالوں میں شراب انڈیلی گئی۔ اسٹالن یا خروشچیٹیا پارٹی کے نام پر جام تجویز کرنے کو کسی کا بھی دل نہ پایا۔ پھر کوئی پکار اٹھا: تاریخ کے لیے! " ، اور اس پر ہم سب نے جام نوش کیا۔

٭٭